تلخیص

تفہیم القرآن

سورۃ الفرقان

ترجمہ و تفسیر

مولانا سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ

تلخیص

مولانا صدرالدین اصلاحیؒ

الفرقان

نام

پہلی ہی آیت تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ سے ماخوذ ہے۔ یہ بھی قرآن کی اکثر سورتوں کے ناموں کی طرح علامت کے طور پر ہے نہ کہ عنوانِ مضمون کے طور پر۔ تاہم مضمونِ سورہ کے ساتھ یہ نام ایک قریبی مناسبت رکھتا ہے جیسا کہ آ گے چل کر معلوم ہوگا۔

زمانۂ نزول

اندازِ بیان اور مضامین پر غور کرنے سے صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس کا زمانۂ نزول بھی وہی ہے جو سورۂ مومنون وغیرہ کا ہے، یعنی زمانۂ قیامِ مکہ کا دَورِ متوسط۔

موضوع ومباحث

اس میں اُن شبہات واعتراضات پر کلام کیا گیا ہے جو قرآن اور محمد ﷺ کی نبوت، اور آپ کی پیش کردہ تعلیم پر کفارِ مکہ کی طرف سے پیش کیے جاتے تھے۔ اُن میں سے ایک ایک کا جچا تلا جواب دیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ دعوتِ حق سے منہ موڑنے کے بُرے نتائج بھی صاف صاف بتائے گئے ہیں۔ آخر میں سورۂ مومنون کی طرح اہلِ ایمان کی اخلاقی خوبیوں کا ایک نقشہ کھینچ کر عوام الناس کے سامنے رکھ دیا گیا ہے کہ اِس کسوٹی پر کس کر دیکھ لو، کون کھوٹا ہے اور کون کھرا۔ ایک طرف اِس سیرت و کردار کے لوگ ہیں جو محمد ﷺ کی تعلیم سے اب تک تیار ہوئے ہیں اور آئندہ تیار کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ دوسری طرف وہ نمونۂ اخلاق ہے جو عام اہلِ عرب میں پایا جاتا ہے اور جسے برقرار رکھنے کے لیے جاہلیت کے علم بردار ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔ اب خود فیصلہ کرو کہ ان دونوں نمونوں میں سے کسے پسند کرتے ہو؟ یہ ایک غیر ملفوظ سوال تھا جو عرب کے ہر باشندے کے سامنے رکھ دیا گیا، اور چند سال کے اندر ایک چھوٹی سی اقلیت کو چھوڑ کر ساری قوم نے اس کا جو جواب دیا وہ جریدۂ روزگار پر ثبت ہو چکا ہے۔

اٰیاتُھا ۷۷ (۲۵) سُوْرَۃُ الْفُرْقَانِ مَکِّیَّۃٌ (۴۲) رُکُوعاتُھا ۶

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

تَبٰرَکَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِہٖ لِیَکُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرًا ۙ﴿۱﴾

اللہ کے نام سے جو بے انتہا مہربان اور رحم فرمانے والا ہے۔

نہایت متبرک[۱] ہے وہ جس نے یہ فرقان[۲] اپنے بندے پر نازل کیا ہے[۳] تا کہ سارے جہان والوں کے لیے خبردار کردینے والا ہو[۴]۔

[۱] اصل میں لفظ تبَارَکَ استعمال ہوا ہے جس کا پورا مفہوم انتہائی فراوانی، بڑھتی اور چڑھتی افزونی، اور کمال درجے کی پائیداری ہے۔ یہ لفظ مختلف مواقع پر مختلف حیثیتوں سے کسی چیز کی فراوانی کے لیے، یا اس کے ثبات و دوام کی کیفیت بیان کرنے کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہاں جو مضمون آگے چل کر بیان ہو رہا ہے اس کو نگاہ میں رکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس جگہ اللہ تعالیٰ کے لیے تبَارَکَ ایک معنی میں نہیں، بہت سے معنوں میں استعمال ہوا ہے: (۱) بڑا محسن اور نہایت باخیر۔ (۲) نہایت بزرگ و باعظمت۔ (۳) نہایت مقدس و منزّہ۔ (۴) نہایت بلند و برتر۔ (۵) کمالِ قدرت کے اعتبار سے برتر۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، المومنون، حاشیہ ۱۴۔ الفرقان، حاشیہ ۱۹)

[۲] یعنی قرآن مجید۔ فرقان مصدر ہے مادّہ ف ر ق سے، جس کے معنی ہیں دو چیزوں کو الگ کرنا، یا ایک ہی چیز کے اجزاء کا الگ الگ ہونا۔ قرآن مجید کے لیے اس لفظ کا استعمال یا تو فارِق کے معنی میں ہوا ہے، یا مفروق کے معنی میں، یا پھر اس سے مقصود مبالغہ ہے، اگر اسے پہلے اور تیسرے معنی میں لیا جائے تو اس کا صحیح ترجمہ کسوٹی، اور فیصلہ کن چیز، اور معیارِ فیصلہ کے ہوں گے۔ اور اگر دوسرے معنی میں لیا جائے تو اس کا مطلب الگ الگ اجزاء پر مشتمل، اور الگ الگ اوقات میں آنے والے اجزاء پر مشتمل چیز کے ہوں گے۔ قرآن مجید کو ان دونوں ہی اعتبارات سے ''الفرقان'' کہا گیا ہے۔

[۳] اصل میں لفظ نَزَّلَ استعمال ہوا ہے جس کے معنی ہیں بتدریج، تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کرنا۔ اس تمہیدی مضمون کی مناسبت آگے چل کر آیت ۳۲ (رکوع ۳) کے مطالعہ سے معلوم ہوگی جہاں کفار مکہ کے اس اعتراض پر گفتگو کی گئی ہے کہ ''یہ قرآن پورا کا پورا ایک ہی وقت میں کیوں نہ اتار دیا گیا''؟

[۴] یعنی خبردار کرنے والا، غفلت اور گمراہی کے بُرے نتائج سے ڈرانے والا۔ اس سے مراد ''فرقان'' بھی ہوسکتا ہے، اور وہ ''بندہ'' بھی جس پر قرآن نازل کیا گیا۔ حقیقت کے اعتبار سے چوں کہ دونوں ایک ہیں، اور ایک ہی کام کے لیے بھیجے گئے ہیں، اس لیے کہنا چاہیے کہ دونوں ہی مراد ہیں۔ پھر یہ جو فرمایا کہ سارے جہان والوں کے لیے نذیر ہو، تو اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی دعوت اور محمد ﷺ کی رسالت کسی ایک ملک کے لیے نہیں، پوری دنیا کے لیے ہے، اور اپنے ہی زمانے کے لیے نہیں، آنے والے تمام زمانوں کے لیے ہے۔ یہ مضمون متعدد مقامات پر قرآن مجید میں بیان ہوا ہے۔ مثلاً (الاعراف، آیت ۱۵۸۔ الانعام آیت ۱۹۔ سبا، آیت ۲۸۔ الانبیاء، آیت ۱۰۷)

الَّذِیۡ لَہٗ مُلۡکُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَلَمۡ یَتَّخِذۡ وَلَدًا وَّلَمۡ یَکُنۡ
لَّہٗ شَرِیۡکٌ فِی الۡمُلۡکِ وَخَلَقَ کُلَّ شَیۡءٍ فَقَدَّرَہٗ تَقۡدِیۡرًا ﴿۲﴾
وَاتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اٰلِـہَۃً لَّا یَخۡلُقُوۡنَ شَیۡئًا وَّہُمۡ یُخۡلَقُوۡنَ
وَلَا یَمۡلِکُوۡنَ لِاَنۡفُسِہِمۡ ضَرًّا وَّلَا نَفۡعًا وَّلَا یَمۡلِکُوۡنَ مَوۡتًا

وہ جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہی کا مالک ہے،[۵] جس نے کسی کو بیٹا نہیں بنایا ہے،[۶] جس کے ساتھ بادشاہی میں کوئی شریک نہیں ہے،[۷] جس نے ہر چیز کو پیدا کیا پھر اس کی ایک تقدیر مقرر کی۔[۸] لوگوں نے اُسے چھوڑ کر ایسے معبود بنا لیے جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں،[۹] جو خود اپنے لیے بھی کسی نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتے، جو نہ مار سکتے ہیں نہ جلا سکتے ہیں،

[۵] دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کے لیے ہے''، یعنی وہی اس کا حق دار ہے اور اسی کے لیے وہ مخصوص ہے۔

[۶] یعنی نہ تو کسی سے اس کا کوئی نسبی تعلق ہے، اور نہ کسی کو اس نے اپنا متبنّٰی بنایا ہے {کہ اس} بنا پر اس کو معبودیت کا استحقاق پہنچتا ہو۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو یونس، حواشی ۶۶ تا ۶۸)

[۷] اصل میں لفظ مُلک استعمال ہوا ہے جو عربی زبان میں بادشاہی، اقتدارِ اعلیٰ، اور حاکمیت (Sovereignity) کے لیے بولا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی ساری کائنات کا مختارِ مطلق ہے اور فرماں روائی کے اختیارات میں ذرّہ برابر بھی کسی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ چیز آپ سے آپ اس بات کو مستلزم ہے کہ پھر معبود بھی اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔

[۸] دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ''ہر چیز کو ایک اندازۂ خاص پر رکھا''، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے صرف یہی نہیں کہ کائنات کی ہر چیز کو وجود بخشا ہے، بلکہ وہی ہے جس نے ایک ایک چیز کے لیے صورت، جسامت، قوت و استعداد، اوصاف و خصائص، کام اور کام کا طریق، بقاء کی مدت، عروج و ارتقاء کی حد، اور دوسری وہ تمام تفصیلات مقرر کی ہیں جو اس چیز کی ذات سے متعلق ہیں، اور پھر اسی نے عالمِ وجود میں وہ اسباب و وسائل اور مواقع پیدا کیے ہیں جن کی بدولت ہر چیز یہاں اپنے اپنے دائرے میں اپنے حصّے کا کام کر رہی ہے۔ {یہ آیت قرآن مجید کی ان جامع آیات میں سے ہے جن میں} توحید کی پوری تعلیم سمیٹ دی گئی ہے۔

[۹] جامع الفاظ ہیں جو ہر قسم کے جعلی معبودوں پر حاوی ہیں۔ وہ بھی جن کو خدا نے پیدا کیا اور انسان ان کو معبود مان بیٹھا، مثلاً فرشتے، جن، انبیاء، اولیاء، سورج، چاند، سیارے، درخت، دریا، جانور وغیرہ۔ اور وہ بھی جن کو انسان خود بناتا ہے اور خود ہی معبود بنا لیتا ہے، مثلاً پتھر اور لکڑی کے بُت۔

وَّلَا حَیٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا ﴿۳﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ
اِلَّآ اِفْكُ ِۨافْتَرٰىهُ وَاَعَانَهٗ عَلَيْهِ قَوْمٌ اٰخَرُوْنَ ۛۚ فَقَدْ
جَآءُوْ ظُلْمًا وَّزُوْرًا ﴿۴﴾ۚۛ وَقَالُوْٓا اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ اكْتَتَبَهَا
فَهِيَ تُمْلٰى عَلَيْهِ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ﴿۵﴾ قُلْ اَنْزَلَهُ الَّذِيْ يَعْلَمُ
السِّرَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اِنَّهٗ كَانَ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿۶﴾

معانقة۔ اعند المتأخرین ۱۲

نہ مرے ہوئے کو پھر اُٹھا سکتے ہیں۔[۱۰]

جن لوگوں نے نبیؐ کی بات ماننے سے انکار کر دیا ہے وہ کہتے ہیں کہ ''یہ فرقان ایک من گھڑت چیز ہے جسے اِس شخص نے آپ ہی گھڑ لیا ہے اور کچھ دوسرے لوگوں نے اِس کام میں اس کی مدد کی ہے۔'' بڑا ظلم[۱۱] اور سخت جھوٹ ہے جس پر یہ لوگ اُتر آئے ہیں۔ کہتے ہیں ''یہ پرانے لوگوں کی لکھی ہوئی چیزیں ہیں جنہیں یہ شخص نقل کراتا ہے اور وہ اِسے صبح و شام سنائی جاتی ہیں۔'' اے نبیؐ، ان سے کہو کہ ''اِسے نازل کیا ہے اُس نے جو زمین اور آسمانوں کا بھید جانتا ہے۔''[۱۲] حقیقت یہ ہے کہ وہ بڑا غفورٌ رحیم ہے۔[۱۳]

[۱۰] حاصل کلام یہ ہوا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے ایک بندے پر فرقان اس لیے نازل کیا کہ حقیقت تو تھی وہ اور لوگ اس سے غافل ہو کر پڑ گئے اس گمراہی میں، لہٰذا ایک بندہ نذیر بنا کر اُٹھایا گیا ہے تا کہ لوگوں کو اس حماقت کے بُرے نتائج سے خبر دار کرے، اور اس پر بتدریج یہ فرقان نازل کرنا شروع کیا گیا ہے تا کہ اس کے ذریعہ سے وہ حق کو باطل سے اور کھرے کو کھوٹے سے الگ کر کے دکھا دے۔

[۱۱] دوسرا ترجمہ ''بڑی بے انصافی کی بات'' بھی ہو سکتا ہے۔

[۱۲] یہ وہی اعتراض ہے جو اس زمانے کے مستشرقینِ مغرب قرآن مجید کے خلاف پیش کرتے ہیں۔ لیکن یہ عجیب بات ہے کہ نبی ﷺ کے ہم عصر دشمنوں میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ تم بچپن میں بحیرا راہب سے جب ملے تھے اس وقت یہ سارے مضامین تم نے سیکھ لیے تھے۔ اور نہ یہ کہا کہ جوانی میں جب تجارتی سفروں کے سلسلے میں تم باہر جایا کرتے تھے اُس زمانے میں تم نے عیسائی راہبوں اور یہودی ربّیوں سے یہ معلومات حاصل کی تھیں۔ اس لیے کہ ان سارے سفروں کا حال ان کو معلوم تھا۔ یہ سفر اکیلے نہیں ہوئے تھے، ان کے اپنے قافلوں کے ساتھ ہوئے تھے اور وہ جانتے تھے کہ ان میں کچھ سیکھ آنے کا الزام ہم لگائیں گے تو ہمارے اپنے ہی شہر میں سیکڑوں زبانیں ہم کو جھٹلا دیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ کفارِ مکہ نے اتنے سفید جھوٹ کی جرأت نہ کی اور اُسے بعد کے زیادہ بے حیا لوگوں کے لیے چھوڑ دیا۔ وہ جو بات کہتے تھے وہ نبوت سے پہلے کے متعلق نہیں بلکہ دعوائے نبوت کے زمانے کے متعلق تھی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ یہ شخص ان پڑھ ہے۔ خود مطالعہ کر کے نئی معلومات حاصل کر نہیں سکتا۔ پہلے اس نے کچھ سیکھا نہ تھا۔ چالیس برس کی عمر تک ان باتوں میں سے کوئی بات بھی نہ جانتا تھا جو آج اس کی زبان سے نکل رہی ہیں۔ اب آخر یہ معلومات آ کہاں سے رہی ہیں؟ ان کا سرچشمہ لامحالہ کچھ اگلے لوگوں کی

کتابیں ہیں جن کے اقتباسات راتوں کو چپکے چپکے ترجمہ اور نقل کرائے جاتے ہیں، انہیں کسی سے یہ شخص پڑھوا کر سنتا ہے، اور پھر انہیں یاد کر کے ہمیں دن کو سناتا ہے۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں وہ چند آدمیوں کے نام بھی لیتے تھے جو اہل کتاب تھے، پڑھے لکھے تھے، اور مکہ میں رہتے تھے، یعنی عدّاس (حویطب بن عبدالعزیٰ کا آزاد کردہ غلام)، یسار (علاء بن الحضرمی کا آزاد کردہ غلام) اور جبر (عامر بن ربیعہ کا آزاد کردہ غلام)۔

بظاہر بڑا وزنی اعتراض معلوم ہوتا ہے۔ مگر جواب میں سرے سے کوئی دلیل پیش نہیں کی گئی، {اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اعتراض فی الواقع تھا ہی اتنا لوچ اور بے وزن کہ اس کے جواب میں بس جھوٹ اور ظلم کہہ دینا کافی تھا۔ اس حقیقت کا ثبوت} ہمیں اُسی ماحول سے مل جاتا ہے جس میں مخالفین اسلام نے یہ اعتراض کیا تھا:

پہلی بات یہ تھی کہ مکے کے وہ ظالم سردار جو ایک ایک مسلمان کو مارتے کوٹتے اور تنگ کرتے پھر رہے تھے، ان کے لیے یہ بات کچھ بھی مشکل نہ تھی کہ جن جن لوگوں کے متعلق وہ کہتے تھے کہ یہ پرانی پرانی کتابوں کے ترجمے کر کر کے محمدؐ کو یاد کرایا کرتے ہیں، ان کے گھروں پر اور خود نبی ﷺ کے گھر پر چھاپے مارتے اور وہ سارا ذخیرہ برآمد کر کے پبلک کے سامنے لا رکھتے جو ان کے زعم میں اِس کام کے لیے فراہم کیا گیا تھا۔ مگر وہ بس زبانی اعتراض ہی کرتے رہے اور ایک دن بھی یہ فیصلہ کن قدم اٹھا کر انہوں نے نہ دکھایا۔

دوسری بات یہ تھی کہ اس سلسلے میں وہ جن لوگوں کے نام لیتے تھے وہ کہیں باہر کے نہ تھے، اسی شہر مکہ کے رہنے والے تھے۔ ان کی قابلیتیں کسی سے چھپی ہوئی نہ تھیں۔ ہر شخص جو تھوڑی سی عقل بھی رکھتا تھا، یہ دیکھ سکتا تھا کہ محمد ﷺ جو چیز پیش کر رہے ہیں وہ کس پائے کی ہے، اور وہ کس درجے کے لوگ ہیں جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ محمدؐ ان سے یہ سب کچھ حاصل کر کر کے لا رہے ہیں۔ اسی وجہ سے کسی نے بھی اس اعتراض کو کوئی وزن نہ دیا۔

تیسری بات یہ تھی کہ وہ سب اشخاص، جن کا اس سلسلے میں نام لیا جا رہا تھا، بیرونی ممالک سے آئے ہوئے غلام تھے جن کو ان کے مالکوں نے آزاد کر دیا تھا۔ عرب کی قبائلی زندگی میں کوئی شخص بھی کسی طاقت ور قبیلے کی حمایت کے بغیر نہ جی سکتا تھا۔ آزاد ہو جانے پر بھی غلام اپنے سابق مالکوں کے وِلاء (سرپرستی) میں رہتے تھے اور ان کی حمایت ہی معاشرے میں ان کے لیے زندگی کا سہارا ہوتی تھی۔ {اب آخر یہ کیسے ممکن تھا کہ} یہ لوگ خود اپنے سرپرستوں کو ناراض کر کے محمد ﷺ کے ساتھ اس سازش میں شریک {ہو جاتے جس سے فائدے کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی تھی۔ البتہ مصائب و مشکلات کے دروازے ان کے لیے لازماً کھل جاتے} یہ اور اسی طرح کے اور بھی وجوہ تھے جن کی بنا پر ہر سننے والے کی نگاہ میں یہ اعتراض آپ ہی بے وزن تھا۔ اس لیے قرآن میں اس کو کسی وزنی اعتراض کی حیثیت سے، جواب دینے کی خاطر نقل نہیں کیا گیا ہے، بلکہ یہ بتانے کی خاطر اس کا ذکر کیا گیا ہے کہ دیکھو، حق کی دشمنی میں یہ لوگ کیسے اندھے ہو گئے ہیں، اور کس قدر صریح جھوٹ اور بے انصافی پر اتر آئے ہیں۔

[۱۳] اس جگہ یہ فقرہ بڑا معنی خیز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کیا شان ہے خدا کی رحیمی و غفاری کی، جو لوگ حق کو نیچا دکھانے کے لیے ایسے ایسے جھوٹ کے طوفان اُٹھاتے ہیں اُن کو بھی وہ مہلت دیتا ہے اور سنتے ہی عذاب کا کوڑا نہیں برسا دیتا۔ اس تنبیہ کے ساتھ اس میں ایک پہلو تلقین کا بھی ہے کہ ظالمو، اب بھی اگر اپنے عناد سے باز آ جاؤ اور حق بات کو سیدھی طرح مان لو تو جو کچھ آج تک کرتے رہے ہو وہ سب معاف ہو سکتا ہے۔

وَقَالُوْا مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي
الْاَسْوَاقِ ؕ لَوْلَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مَلَكٌ فَيَكُوْنَ مَعَهٗ نَذِيْرًا ۙ﴿۷﴾
اَوْ يُلْقٰۤى اِلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ تَكُوْنُ لَهٗ جَنَّةٌ يَّاْكُلُ مِنْهَا ؕ وَقَالَ
الظّٰلِمُوْنَ اِنْ تَتَّبِعُوْنَ اِلَّا رَجُلًا مَّسْحُوْرًا ﴿۸﴾ اُنْظُرْ كَيْفَ
ضَرَبُوْا لَكَ الْاَمْثَالَ فَضَلُّوْا فَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَبِيْلًا ﴿۹﴾ ع ۹/۱۶

کہتے ہیں "یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا ہے اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے؟[۱۴] کیوں نہ اس کے پاس کوئی فرشتہ بھیجا گیا جو اس کے ساتھ رہتا اور (نہ ماننے والوں کو) دھمکاتا؟[۱۵] یا اور کچھ نہیں تو اِس کے لیے کوئی خزانہ ہی اتار دیا جاتا، یا اس کے پاس کوئی باغ ہی ہوتا جس سے یہ (اطمینان کی) روزی حاصل کرتا۔"[۱۶] اور یہ ظالم کہتے ہیں "تم لوگ تو ایک سحر زدہ[۱۷] آدمی کے پیچھے لگ گئے ہو۔" دیکھو، کیسی کیسی حجتیں یہ لوگ تمہارے آگے پیش کر رہے ہیں، ایسے بہکے ہیں کہ کوئی ٹھکانے کی بات اِن کو نہیں سوجھتی۔[۱۸] ع

[۱۴] یعنی اول تو انسان کا رسول ہونا ہی عجیب بات ہے۔ تاہم اگر آدمی نبی رسول بنایا گیا تھا تو کم از کم وہ بادشاہوں اور دنیا کے بڑے لوگوں کی طرح ایک بلند پایہ ہستی ہونا چاہیے تھا، نہ یہ کہ ایک ایسا عامی آدمی خداوندِ عالم کا پیغمبر بنا دیا جائے جو بازاروں میں جوتیاں چٹخاتا پھرتا ہو۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، المومنون، حاشیہ: ۲۶)

[۱۵] یعنی اگر آدمی ہی کو نبی بنایا گیا تھا تو ایک فرشتہ اس کے ساتھ کر دیا جاتا جو ہر وقت کوڑا ہاتھ میں لیے رہتا اور لوگوں سے کہتا کہ مانو اس کی بات، ورنہ ابھی خدا کا عذاب برسا دیتا ہوں۔ یہ تو بڑی عجیب بات ہے کہ کائنات کا مالک ایک شخص کو نبوت کا جلیل القدر منصب عطا کر کے بس یونہی اکیلا چھوڑ دے اور وہ لوگوں سے گالیاں اور پتھر کھاتا پھرے۔

[۱۶] یہ گویا بدرجۂ آخر ان کا مطالبہ تھا کہ اللہ میاں کم از کم اتنا تو کرتے کہ اپنے رسول کے لیے معاش کا کوئی اچھا انتظام کر دیتے۔ یہ کیا ماجرا ہے کہ خدا کا رسول ہمارے معمولی رئیسوں سے بھی گیا گزرا ہو۔

[۱۷] یعنی دیوانہ۔ اہلِ عرب کے نزدیک دیوانگی کے دو ہی وجوہ تھے۔ یا تو کسی پر جن کا سایہ ہو گیا ہو۔ یا کسی دشمن نے جادو کر کے پاگل بنا دیا ہو۔ ایک تیسری وجہ ان کے نزدیک اور بھی تھی، اور وہ یہ کہ کسی دیوی، یا دیوتا کی شان میں آدمی کوئی گستاخی کر بیٹھا ہو اور اس کی مار پڑ گئی ہو۔ کفار مکہ وقتاً فوقتاً یہ تینوں وجوہ نبی ﷺ کے متعلق بیان کرتے تھے۔

[۱۸] یہ اعتراضات بھی جواب دینے کے لیے نہیں بلکہ یہ بتانے کے لیے نقل کیے جا رہے ہیں کہ معترضین کس قدر عناد اور تعصب میں اندھے ہو چکے ہیں۔ ان کی جو باتیں اوپر نقل کی گئی ہیں ان میں سے کوئی بھی اس لائق نہیں ہے کہ اس پر سنجیدگی کے ساتھ بحث کی جائے۔ ان کا بس ذکر کر دینا ہی یہ بتانے کے لیے کافی ہے کہ مخالفین کا دامن معقول دلائل سے کس قدر خالی ہے اور وہ کیسی لچر اور پوچ باتوں سے ایک مدلّل اصولی دعوت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ ایک شخص {ان کے سامنے اللہ کا پیغام رکھتا ہے، توحید اور آخرت اور وحی و رسالت کے حقائق پیش کرتا ہے اور واضح دلائل کے ساتھ پیش کرتا ہے}۔ مگر مخالفت کرنے والے ان میں سے کسی {بات پر بھی کان نہیں

تَبٰرَكَ الَّذِيْٓ اِنْ شَآءَ جَعَلَ لَكَ خَيْرًا مِّنْ ذٰلِكَ جَنّٰتٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۙ وَيَجْعَلْ لَّكَ قُصُوْرًا ۝۱۰ بَلْ كَذَّبُوْا
بِالسَّاعَةِ ۣ وَاَعْتَدْنَا لِمَنْ كَذَّبَ بِالسَّاعَةِ سَعِيْرًا ۝۱۱
اِذَا رَاَتْهُمْ مِّنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ سَمِعُوْا لَهَا تَغَيُّظًا وَّزَفِيْرًا ۝۱۲

بڑا بابرکت ہے[۱۹] وہ جو اگر چاہے تو ان کی تجویز کردہ چیزوں سے بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر تم کو دے سکتا ہے، (ایک نہیں) بہت سے باغ جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں، اور بڑے بڑے محل۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ لوگ ''اُس گھڑی''[۲۰] کو جھٹلا چکے ہیں[۲۱] ــــ اور جو اُس گھڑی کو جھٹلائے اس کے لیے ہم نے بھڑکتی ہوئی آگ مہیا کر رکھی ہے۔ وہ جب دُور سے اِن کو دیکھے گی[۲۲] تو یہ اُس کے غضب اور جوش کی آوازیں سن لیں گے۔

دھرتے}۔ پوچھتے ہیں تو یہ پوچھتے ہیں کہ تم کھاتے کیوں ہو؟ بازاروں میں کیوں چلتے پھرتے ہو؟ تمہاری اردلی میں کوئی فرشتہ کیوں نہیں ہے؟ تمہارے پاس کوئی خزانہ یا باغ کیوں نہیں ہے؟ یہ باتیں خود ہی بتا رہی تھیں کہ فریقین میں سے حق پر کون ہے اور کون اس کے مقابلے میں عاجز ہو کر بے تکی ہانک رہا ہے۔

[۱۹] یہاں پھر وہی تَبَارَکَ کا لفظ استعمال ہوا ہے اور بعد کا مضمون بتا رہا ہے کہ اس جگہ اس کے معنی ہیں ''بڑے وسیع ذرائع کا مالک ہے۔'' ''غیر محدود قدرت رکھنے والا ہے۔'' ''اِس سے بالاتر ہے کہ کسی کے حق میں کوئی بھلائی کرنا چاہے اور نہ کر سکے۔''

[۲۰] اصل میں لفظ اَلسَّاعَۃ استعمال ہوا ہے۔ ساعت کے معنی گھڑی اور وقت کے ہیں اور ال اس پر عہد کا ہے، یعنی وہ مخصوص گھڑی جو آنے والی ہے، جس کے متعلق ہم پہلے تم کو خبر دے چکے ہیں۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ یہ لفظ ایک اصطلاح کے طور پر اُس وقتِ خاص کے لیے بولا گیا ہے جب کہ قیامت قائم ہوگی۔

[۲۱] یعنی جو باتیں یہ کر رہے ہیں ان کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کو واقعی کسی قابلِ لحاظ بنیاد پر قرآن کے جعلی کلام ہونے کا شبہ ہے، یا انہیں تمہاری رسالت پر ایمان لانے سے بس اس چیز نے روک رکھا ہے کہ تم کھانا کھاتے اور بازاروں میں چلتے پھرتے ہو، یا وہ تمہاری تعلیمِ حق کو مان لینے کے لیے تیار تھے مگر صرف اس لیے رک گئے کہ نہ کوئی فرشتہ تمہاری اردلی میں تھا اور نہ تمہارے لیے کوئی خزانہ اتارا گیا تھا۔ اصل وجہ ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے بلکہ آخرت کا انکار ہے، جس نے ان کو حق اور باطل کے معاملے میں بالکل غیر سنجیدہ بنا دیا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ سرے سے کسی غور و فکر اور تحقیق و جستجو کی ضرورت ہی محسوس نہیں کرتے، اور تمہاری معقول دعوت کو رد کرنے کے لیے ایسی ایسی مضحکہ انگیز حجتیں پیش کرنے لگتے ہیں۔

[۲۲] آگ کا کسی کو دیکھنا ممکن ہے کہ استعارے کے طور پر ہو، جیسے ہم کہتے ہیں، وہ جامع مسجد کے مینار تم کو دیکھ رہے ہیں، اور ممکن ہے حقیقی معنوں میں ہو، یعنی جہنم کی آگ دنیا کی آگ کی طرح بے شعور نہ ہو بلکہ دیکھ بھال کر جلانے والی ہو۔

وَ اِذَآ اُلْقُوْا مِنْهَا مَكَانًا ضَيِّقًا مُّقَرَّنِيْنَ دَعَوْا هُنَالِكَ
ثُبُوْرًا ؕ ﴿۱۳﴾ لَا تَدْعُوا الْيَوْمَ ثُبُوْرًا وَّاحِدًا وَّادْعُوْا ثُبُوْرًا
كَثِيْرًا ﴿۱۴﴾ قُلْ اَذٰلِكَ خَيْرٌ اَمْ جَنَّةُ الْخُلْدِ الَّتِيْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ
كَانَتْ لَهُمْ جَزَآءً وَّمَصِيْرًا ﴿۱۵﴾ لَهُمْ فِيْهَا مَا يَشَآءُوْنَ
خٰلِدِيْنَ ؕ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْئُوْلًا ﴿۱۶﴾ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ
وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَقُوْلُ ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ

اور جب یہ دست و پابستہ اُس میں ایک تنگ جگہ ٹھونسے جائیں گے تو اپنی موت کو پکارنے لگیں گے۔ (اُس وقت ان سے کہا جائے گا کہ) آج ایک موت نہیں، بہت سی موتوں کو پکارو۔

اِن سے پوچھو، یہ انجام اچھا ہے یا وہ اَبدی جنت جس کا وعدہ خداترس پرہیزگاروں سے کیا گیا ہے؟ جو اُن کے عمل کی جزا اور اُن کے سفر کی آخری منزل ہوگی، جس میں اُن کی ہر خواہش پوری ہوگی، جس میں وہ ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، جس کا عطا کرنا تمہارے رب کے ذمے ایک واجب الادا وعدہ ہے۔[۲۳]

اور وہی دن ہوگا جب کہ (تمہارا رب) اِن لوگوں کو بھی گھیر لائے گا اور ان کے اُن معبودوں[۲۴] کو بھی بلالے گا جنہیں آج یہ اللہ کو چھوڑ کر پوج رہے ہیں، پھر وہ اُن سے پوچھے گا "کیا تم نے میرے اِن بندوں کو گمراہ کیا تھا؟

[۲۳] اصل الفاظ ہیں وَعْدًا مَّسْئُوْلًا یعنی ایسا وعدہ جس کے پورا کرنے کا مطالبہ کیا جاسکتا ہے۔
یہاں ایک شخص یہ سوال اُٹھا سکتا ہے کہ جنت کا یہ وعدہ اور دوزخ کا یہ ڈراوا کسی ایسے شخص پر کیا اثر انداز ہوسکتا ہے جو قیامت اور حشر و نشر اور جنت و دوزخ کا پہلے ہی منکر ہو؟ اس لحاظ سے تو یہ بظاہر ایک بے محل کلام محسوس ہوتا ہے، لیکن تھوڑا سا غور کیا جائے تو بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ اگر معاملہ یہ ہو کہ میں ایک بات منوانا چاہتا ہوں اور دوسرا نہیں ماننا چاہتا تو بحث و حجت کا انداز کچھ اور ہوتا ہے۔ لیکن اگر میں اپنے مخاطب سے اس انداز میں گفتگو کر رہا ہوں کہ زیرِ بحث مسئلہ میری بات ماننے یا نہ ماننے کا نہیں بلکہ تمہارے اپنے مفاد کا ہے، تو مخاطب چاہے کیسا ہی ہٹ دھرم ہو، ایک دفعہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ یہاں کلام کا طرز یہی دوسرا ہے۔ اس صورت میں مخاطب کو خود اپنی بھلائی کے نقطۂ نظر سے یہ سوچنا پڑتا ہے کہ دوسری زندگی کے ہونے کا چاہے ثبوت موجود نہ ہو، مگر بہر حال اس کے نہ ہونے کا بھی کوئی ثبوت نہیں ہے، اور امکان دونوں ہی کا ہے۔ اب اگر کہیں بات وہی حق نکلی جو یہ شخص کہہ رہا ہے تو یقیناً پھر ہماری خیر نہیں ہے۔ اس طرح یہ طرزِ کلام مخاطب کی ہٹ دھرمی میں ایک شگاف ڈال دیتا ہے، اور اس شگاف میں مزید وسعت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب قیامت، حشر، حساب اور جنت و دوزخ کا ایسا تفصیلی نقشہ پیش کیا جانے لگتا ہے کہ جیسے کوئی وہاں کا آنکھوں دیکھا حال بیان کر رہا ہو۔
(مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، حٰمٓ السجدہ، آیت ۵۲، حاشیہ ۶۹۔ الاحقاف، آیت ۱۰)

[۲۴] آگے کا مضمون خود ظاہر کر رہا ہے کہ یہاں معبودوں سے مراد بُت نہیں ہیں بلکہ فرشتے، انبیاء، اولیاء، شہداء اور صالحین ہیں جنہیں مختلف قوموں کے مشرکین معبود بنا بیٹھے ہیں۔

عِبَادِيْ هٰٓؤُلَآءِ اَمْ هُمْ ضَلُّوا السَّبِيْلَ ﴿١٧﴾ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ
مَا كَانَ يَنْۢبَغِيْ لَنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ مِنْ دُوْنِكَ مِنْ اَوْلِيَآءَ وَلٰكِنْ
مَّتَّعْتَهُمْ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى نَسُوا الذِّكْرَ ۚ وَكَانُوْا قَوْمًاۢ بُوْرًا ﴿١٨﴾
فَقَدْ كَذَّبُوْكُمْ بِمَا تَقُوْلُوْنَ ۙ فَمَا تَسْتَطِيْعُوْنَ صَرْفًا
وَّلَا نَصْرًا ۚ وَمَنْ يَّظْلِمْ مِّنْكُمْ نُذِقْهُ عَذَابًا كَبِيْرًا ﴿١٩﴾

یا یہ خود راہِ راست سے بھٹک گئے تھے؟"[۲۵] وہ عرض کریں گے" پاک ہے آپ کی ذات، ہماری تو یہ بھی مجال نہ تھی کہ آپ کے سوا کسی کو اپنا مولیٰ بنائیں۔ مگر آپ نے اِن کو اور ان کے باپ دادا کو خوب سامانِ زندگی دیا حتیٰ کہ یہ سبق بھول گئے اور شامت زدہ ہو کر رہے۔"[۲۶] یوں جھٹلا دیں گے وہ (تمہارے معبود) تمہاری اُن باتوں کو جو آج تم کہہ رہے ہو،[۲۷] پھر تم نہ اپنی شامت کو ٹال سکو گے، نہ کہیں سے مدد پا سکو گے اور جو بھی تم میں سے ظلم کرے[۲۸] اُسے ہم سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے۔[۲۹]

[۲۵] یہ مضمون متعدد مقامات پر قرآن مجید میں آیا ہے۔ مثلاً سورۂ سبا میں ہے،" جس روز وہ ان سب کو جمع کرے گا، پھر فرشتوں سے پوچھے گا کیا یہ لوگ تمہاری ہی بندگی کر رہے تھے؟ وہ کہیں گے پاک ہے آپ کی ذات، ہمارا تعلق تو آپ سے ہے نہ کہ اِن سے۔ یہ لوگ تو جنوں (یعنی شیاطین) کی بندگی کر رہے تھے۔ ان میں سے اکثر انہی کے مومن تھے۔" (آیات ۴۰، ۴۱) اسی طرح سورۂ مائدہ کے آخری رکوع میں ہے: " اور جب اللہ پوچھے گا اے مریم کے بیٹے عیسیٰ، کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ خدا کو چھوڑ کر مجھے اور میری ماں کو معبود بنالو؟ وہ عرض کرے گا پاک ہے آپ کی ذات، میرے لیے یہ کب زیبا تھا کہ وہ بات کہتا جس کے کہنے کا مجھے حق نہ تھا.... میں نے تو ان سے بس وہی کچھ کہا تھا جس کا آپ نے مجھے حکم دیا تھا، یہ کہ اللہ کی بندگی کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔"

[۲۶] یعنی یہ کم ظرف اور کمینے لوگ تھے۔ آپ نے رزق دیا تھا کہ شکر کریں۔ یہ کھا پی کر نمک حرام ہو گئے اور وہ سب نصیحتیں بھلا بیٹھے جو آپ کے بھیجے ہوئے انبیاء نے ان کو کی تھیں۔

[۲۷] یعنی تمہارا یہ مذہب، جس کو تم حق سمجھے بیٹھے ہو، بالکل بے اصل ثابت ہوگا، اور تمہارے وہ معبود جن پر تمہیں بھروسہ ہے کہ یہ خدا کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں، اُلٹے تم کو خطا کار ٹھیرا کر بری الذمہ ہو جائیں گے۔ تم نے جو کچھ بھی اپنے معبودوں کو قرار دے رکھا ہے، بطور خود ہی قرار دے رکھا ہے۔ اُن میں سے کسی نے بھی تم سے یہ نہ کہا تھا کہ ہمیں یہ کچھ مانو۔

[۲۸] یہاں ظلم سے مراد حقیقت اور صداقت پر ظلم ہے، یعنی کفر و شرک۔ سیاق و سباق خود ہی ظاہر کر رہا ہے کہ نبی کو نہ ماننے والے اور خدا کے بجائے دوسروں کو معبود بنا بیٹھنے والے اور آخرت کا انکار کرنے والے "ظلم" کے مرتکب قرار دیے جا رہے ہیں۔

[۲۹] یہ جواب ہے کفار مکہ کی اُس بات کا جو وہ کہتے تھے کہ یہ کیسا رسول ہے جو کھانا کھاتا اور بازاروں میں چلتا پھرتا ہے۔ اس موقع پر یہ بات ذہن میں رہے کہ کفار مکہ حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسمٰعیلؑ، حضرت موسیٰؑ اور بہت سے دوسرے انبیاء سے نہ صرف واقف تھے، بلکہ ان کی رسالت بھی تسلیم کرتے تھے۔ اس لیے فرمایا گیا کہ آخر محمد ﷺ کے بارے میں یہ نرالا اعتراض کیوں اُٹھا رہے ہو؟ پہلے کون سا نبی ایسا آیا ہے جو کھانا نہ کھاتا ہو اور بازاروں میں نہ چلتا پھرتا ہو؟

وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ
الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ ط وَجَعَلْنَا بَعْضَكُمْ
لِبَعْضٍ فِتْنَةً ط اَتَصْبِرُوْنَ ج وَكَانَ رَبُّكَ بَصِيْرًا ﴿۲۰﴾ ع ۲ ۱۱ ۱۷
وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الجزء ۱۹

اے نبیؐ، تم سے پہلے جو رسول بھی ہم نے بھیجے تھے وہ سب بھی کھانا کھانے والے اور بازاروں میں چلنے پھرنے والے لوگ ہی تھے۔ دراصل ہم نے تم لوگوں کو ایک دوسرے کے لیے آزمائش کا ذریعہ بنا دیا ہے۔[۳۰] کیا تم صبر کرتے ہو؟[۳۱] تمہارا رب سب کچھ دیکھتا ہے۔[۳۲] ع

جو لوگ ہمارے حضور پیش ہونے کا اندیشہ نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں "کیوں نہ فرشتے ہمارے پاس بھیجے جائیں؟[۳۳]

[۳۰] یعنی رسول اور اہل ایمان کے لیے منکرین آزمائش ہیں اور منکرین کے لیے رسول اور اہل ایمان۔ منکرین نے ظلم وستم اور جاہلانہ عداوت کی جو بھٹی گرم کر رکھی ہے وہی تو وہ ذریعہ ہے جس سے ثابت ہوگا کہ رسول اور اس کے صادق الایمان پیرو کھرا سونا ہیں۔ کھوٹ جس میں بھی ہوگی وہ اس بھٹی سے بخیریت نہ گزر سکے گا، اور اس طرح خالص اہل ایمان کا ایک چیدہ گروہ چھٹ کر نکل آئے گا جس کے مقابلے میں پھر دنیا کی کوئی طاقت نہ ٹھیر سکے گی۔ دوسری طرف منکرین کے لیے بھی رسول اور اصحابِ رسول ایک سخت آزمائش ہیں۔ ایک عام انسان کا اپنی ہی برادری کے درمیان سے یکا یک نبی بنا کر اُٹھا دیا جانا، اُس کے پاس کوئی فوج فرّا اور مال و دولت نہ ہونا، اس کے ساتھ کلام الٰہی اور پاکیزہ سیرت کے سوا کوئی عجوبہ چیز نہ ہونا، اُس کے ابتدائی پیروؤں میں زیادہ تر غریبوں، غلاموں اور نوعمر لوگوں کا شامل ہونا اور اللہ تعالیٰ کا ان چند مٹھی بھر انسانوں کو گویا بھیڑیوں کے درمیان بے سہارا چھوڑ دینا، یہی وہ چھلنی ہے جو غلط قسم کے آدمیوں کو دین کی طرف آنے سے روکتی ہے اور صرف ایسے ہی لوگوں کو چھان چھان کر آگے گزارتی ہے جو حق کو پہچاننے والے اور راستی کو ماننے والے ہوں۔

[۳۱] یعنی اس مصلحت کو سمجھ لینے کے بعد کیا اب تم کو صبر آگیا کہ آزمائش کی یہ حالت اُس مقصدِ خیر کے لیے نہایت ضروری ہے جس کے لیے تم کام کر رہے ہو؟ کیا اب تم وہ چوٹیں کھانے پر راضی ہو جو اس آزمائش کے دور میں لگنی ناگزیر ہیں؟

[۳۲] اس کے دو معنی ہیں اور غالباً دونوں ہی مراد ہیں۔ ایک یہ کہ تمہارا رب جو کچھ کر رہا ہے کچھ دیکھ کر ہی کر رہا ہے، اس کی نگری اندھیر نگری نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ جس خلوص اور راست بازی کے ساتھ اس کٹھن خدمت کو تم انجام دے رہے ہو وہ بھی تمہارے رب کی نگاہ میں ہے، اور تمہاری مساعی خیر کا مقابلہ جن زیادتیوں اور بے ایمانیوں سے کیا جا رہا ہے وہ بھی اس سے کچھ چھپا ہوا نہیں ہے۔ لہٰذا پورا اطمینان رکھو کہ نہ تم اپنی خدمات کی قدر سے محروم رہو گے اور نہ وہ اپنی زیادتیوں کے وبال سے بچ رہ جائیں گے۔

[۳۳] یعنی اگر واقعی خدا کا ارادہ یہ ہے کہ ہم تک اپنا پیغام پہنچائے تو، ہر شخص کے پاس ایک فرشتہ آنا چاہیے جو اسے بتائے کہ تیرا رب تجھے یہ ہدایت دیتا ہے۔ یا فرشتوں کا ایک وفد مجمعِ عام میں ہم سب کے سامنے آجائے اور خدا کا پیغام پہنچا دے۔ سورۂ انعام (آیت: ۱۲۴) میں بھی ان کے اس اعتراض کو نقل کیا گیا ہے۔

الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ نَرٰى رَبَّنَا ؕ لَقَدِ اسْتَكْبَرُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ وَعَتَوْ عُتُوًّا
كَبِیْرًا ﴿٢١﴾ یَوْمَ یَرَوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ لَا بُشْرٰى یَوْمَئِذٍ لِّلْمُجْرِمِیْنَ
وَیَقُوْلُوْنَ حِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿٢٢﴾ وَقَدِمْنَآ اِلٰى مَا عَمِلُوْا مِنْ عَمَلٍ
فَجَعَلْنٰهُ هَبَآءً مَّنْثُوْرًا ﴿٢٣﴾ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ یَوْمَئِذٍ خَیْرٌ مُّسْتَقَرًّا
وَّاَحْسَنُ مَقِیْلًا ﴿٢٤﴾ وَیَوْمَ تَشَقَّقُ السَّمَآءُ بِالْغَمَامِ وَنُزِّلَ الْمَلٰٓئِكَةُ
تَنْزِیْلًا ﴿٢٥﴾ اَلْمُلْكُ یَوْمَئِذِ ٍالْحَقُّ لِلرَّحْمٰنِ ؕ وَكَانَ یَوْمًا عَلَى

یا پھر ہم اپنے رب کو دیکھیں۔“[۳۴] بڑا گھمنڈ لے بیٹھے یہ اپنے نفس میں[۳۵] اور حد سے گزر گئے یہ اپنی سرکشی میں۔ جس روز یہ فرشتوں کو دیکھیں گے وہ مجرموں کے لیے کسی بشارت کا دن نہ ہوگا،[۳۶] چیخ اُٹھیں گے کہ پناہ بخدا، اور جو کچھ بھی ان کا کیا دھرا ہے اُسے لے کر ہم غبار کی طرح اُڑا دیں گے۔[۳۷] بس وہی لوگ جو جنت کے مستحق ہیں اُس دن اچھی جگہ ٹھیریں گے اور دوپہر گزارنے کو عمدہ مقام پائیں گے۔[۳۸] آسمان کو چیرتا ہوا ایک بادل اُس روز نمودار ہوگا اور فرشتوں کے پرے کے پرے اُتار دیے جائیں گے۔ اُس روز حقیقی بادشاہی صرف رحمان کی ہوگی۔[۳۹] اور وہ منکرین کے لیے بڑا

[۳۴] یعنی اللہ میاں خود تشریف لے آئیں اور فرمائیں کہ بندو، میری تم سے یہ التماس ہے۔

[۳۵] دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے: ”بڑی چیز سمجھ لیا اپنی دانست میں انہوں نے اپنے آپ کو۔“

[۳۶] یہی مضمون سورۂ انعام، آیت ۸ اور سورۂ حجر، آیات ۷، ۸ اور آیات ۵۱ تا ۶۴ میں تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا ہے۔ اس کے علاوہ۔ سورۂ بنی اسرائیل، آیات ۹۰ تا ۹۵ میں بھی کفار کے بہت سے عجیب وغریب مطالبات کے ساتھ اِس کا ذکر کر کے جواب دیا گیا ہے۔

[۳۷] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، ابراہیم، حواشی ۲۵، ۲۶۔

[۳۸] یعنی میدانِ حشر میں جنت کے مستحق لوگ وہ عزّت کے ساتھ بٹھائے جائیں گے اور روزِ حشر کی سخت دوپہر گزارنے کے لیے اُن کو آرام کی جگہ دی جائے گی۔ اُس دن کی ساری سختیاں مجرموں کے لیے ہوں گی نہ کہ نیکوکاروں کے لیے۔ جیسا کہ حدیث میں آیا ہے، حضورؐ نے فرمایا ”قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے، قیامت کا عظیم الشان اور خوف ناک دن ایک مومن کے لیے بہت ہلکا کر دیا جائے گا، حتیٰ کہ اتنا ہلکا جتنا دنیا میں ایک فرض نماز پڑھنے کا وقت ہوتا ہے۔“ (مسند احمد بروایت ابی سعید خدریؓ)

[۳۹] یعنی وہ ساری مجازی بادشاہیاں اور ریاستیں ختم ہو جائیں گی جو دنیا میں انسان کو دھوکے میں ڈالتی ہیں۔ وہاں صرف ایک بادشاہی باقی رہ جائے گی اور وہ وہی اللہ کی بادشاہی ہے جو اس کائنات کا حقیقی فرماں روا ہے۔ سورۂ مومن میں ارشاد ہوا ہے یَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ لَایَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَیْءٌ ؕ لِمَنِ الْمُلْكُ الْیَوْمَ ؕ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ○ ”وہ دن جب کہ یہ سب لوگ بے نقاب ہوں گے، اللہ سے ان کی کوئی چیز چھپی ہوئی نہ ہوگی۔ پوچھا جائے گا آج بادشاہی کس کی ہے؟ ہر طرف سے جواب آئے گا اکیلے اللہ کی جو سب پر غالب ہے“ (آیت: ۱۶)۔ حدیث میں اس مضمون کو اور زیادہ کھول دیا گیا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ ایک ہاتھ میں آسمانوں اور

الْكٰفِرِيْنَ عَسِيْرًا ﴿٢٦﴾ وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ
يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ﴿٢٧﴾ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ
اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ﴿٢٨﴾ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ؕ
وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ﴿٢٩﴾ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ
قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ﴿٣٠﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ
نَبِيٍّ عَدُوًّا مِّنَ الْمُجْرِمِيْنَ ؕ وَكَفٰى بِرَبِّكَ هَادِيًا وَّنَصِيْرًا ﴿٣١﴾

سخت دن ہوگا۔ ظالم انسان اپنا ہاتھ چبائے گا اور کہے گا" کاش میں نے رسول کا ساتھ دیا ہوتا۔ ہائے میری کم بختی، کاش میں نے فلاں شخص کو دوست نہ بنایا ہوتا۔ اُس کے بہکائے میں آ کر میں نے وہ نصیحت نہ مانی جو میرے پاس آئی تھی، شیطان انسان کے حق میں بڑا ہی بے وفا نکلا۔"[۴۰] اور رسول کہے گا کہ "اے میرے رب، میری قوم کے لوگوں نے اس قرآن کو نشانۂ تضحیک[۴۱] بنالیا تھا۔"

اے نبیؐ، ہم نے تو اسی طرح مجرموں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے[۴۲] اور تمہارے لیے تمہارا رب ہی رہنمائی اور مدد کو کافی ہے۔[۴۳]

دوسرے ہاتھ میں زمین کو لے کر فرمائے گا انا الملک، انا الدیان، این ملوک الارض؟ این الجبارون؟ این المتکبرون؟" میں ہوں بادشاہ، میں ہوں فرماں روا، اب کہاں ہیں وہ زمین کے بادشاہ؟ کہاں ہیں وہ جبار؟ کہاں ہیں وہ متکبر لوگ"؟ (یہ روایت مسند احمد، بخاری، مسلم اور ابوداؤد میں تھوڑے تھوڑے لفظی اختلافات کے ساتھ بیان ہوئی ہے)

[۴۰] ہوسکتا ہے کہ یہ بھی کافر ہی کے قول کا ایک حصہ ہو۔ اور ہوسکتا ہے کہ یہ اس کے قول پر اللہ تعالیٰ کا اپنا ارشاد ہو۔ اس دوسری صورت میں مناسب ترجمہ یہ ہوگا" اور شیطان تو ہے ہی انسان کو عین وقت پر دغا دینے والا۔"

[۴۱] اصل میں لفظ مَھْجُوراً استعمال ہوا ہے۔ اگر اسے ھَجر سے مشتق مانا جائے تو معنی ہوں گے متروک، یعنی ان لوگوں نے قرآن کو قابلِ التفات ہی نہ سمجھا۔ اور اگر ھُجر سے مشتق مانا جائے تو اس کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ انہوں نے اسے ہذیان اور بکواس سمجھا۔ دوسرے یہ کہ انہوں نے اسے اپنے ہذیان اور اپنی بکواس کا ہدف بنالیا۔

[۴۲] یعنی آج جو دشمنی تمہارے ساتھ کی جارہی ہے یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ {ہر نبی کے ساتھ ایسا ہی ہوتا رہا ہے}۔ یہ مضمون سورۂ انعام آیات ۱۱۲، ۱۱۳ میں بھی گزر چکا ہے۔

اور یہ جو فرمایا کہ ہم نے ان کو دشمن بنایا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا قانونِ فطرت یہی کچھ ہے، لہٰذا ہماری اس مشیت پر صبر کرو، اور قانونِ فطرت کے تحت جن حالات سے دوچار ہونا ناگزیر ہے ان کا مقابلہ ٹھنڈے دل اور مضبوط عزم کے ساتھ کرتے چلے جاؤ۔

[۴۳] رہنمائی سے مراد صرف علمِ حق عطا کرنا ہی نہیں ہے، بلکہ تحریک اسلامی کو کامیابی کے ساتھ چلانے کے لیے، اور دشمنوں کی چالوں کو شکست دینے کے لیے بروقت صحیح تدبیریں سجھانا بھی ہے۔ اور مدد سے مراد ہر قسم کی مدد ہے۔ حق اور باطل کی کشمکش میں جتنے محاذ

عند المتقدمین ۱۲ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً
مع وَّاحِدَةً ۛ كَذٰلِكَ ۛ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ﴿۳۲﴾

منکرین کہتے ہیں ’’اِس شخص پر سارا قرآن ایک ہی وقت میں کیوں نہ اُتار دیا گیا؟‘‘[۴۴] —— ہاں، ایسا اس لیے کیا گیا ہے کہ اس کو اچھی طرح ہم تمہارے ذہن نشین کرتے رہیں[۴۵]

بھی کھلیں ہر ایک پر اہلِ حق کی تائید میں کمک پہنچانا اللہ کا کام ہے۔ اور کوئی پہلو مدد اور راہ نمائی کا ایسا نہیں ہے جس میں اہلِ حق کے لیے اللہ کافی نہ ہو، بشرطیکہ وہ اللہ کی کفایت پر ایمان واعتماد رکھیں اور ہاتھ پر ہاتھ دھرے نہ بیٹھے رہیں بلکہ سرگرمی کے ساتھ باطل کے مقابلے میں حق کی سربلندی کے لیے جانیں لڑائیں۔

یہ بات نگاہ میں رہے کہ آیت کا یہ دوسرا حصہ نہ ہوتا تو پہلا حصہ انتہائی دل شکن تھا۔ اس سے بڑھ کر ہمت توڑ دینے والی چیز اور کیا ہوسکتی ہے کہ ایک شخص کو یہ خبر دی جائے کہ ہم نے جان بوجھ کر تیرے سپرد ایک ایسا کام کیا ہے جسے شروع کرتے ہی دنیا بھر کے کُتّے اور بھیڑیے تجھے لپٹ جائیں گے۔ لیکن اس اطلاع کی ساری خوف ناکی یہ حرفِ تسلی سن کر دور ہو جاتی ہے کہ اس جاں گُسل کش مکش کے میدان میں اتار کر ہم نے تجھے اکیلا نہیں چھوڑ دیا ہے بلکہ ہم خود تیری حمایت کو موجود ہیں۔

[۴۴] سوال کا مطلب یہ تھا کہ اگر یہ واقعی خدا کی کتاب ہے تو پوری کتاب اکٹھی ایک وقت میں کیوں نہیں آجاتی۔ خدا تو جانتا ہے کہ پوری بات کیا ہے جو وہ فرمانا چاہتا ہے۔ وہ نازل کرنے والا ہوتا تو سب کچھ بیک وقت فرما دیتا۔ یہ جو سوچ سوچ کر کبھی کچھ مضمون لایا جاتا ہے اور کبھی کچھ، یہ اس بات کی صریح علامت ہے کہ وحی اوپر سے نہیں آتی، یہیں کہیں سے حاصل کی جاتی ہے، یا خود گھڑ گھڑ کر لائی جاتی ہے۔

[۴۵] دوسرا ترجمہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ’’اس کے ذریعہ سے ہم تمہارا دل مضبوط کرتے رہیں‘‘، یا ’’تمہاری ہمت بندھاتے رہیں۔‘‘ الفاظ دونوں مفہوموں پر حاوی ہیں اور دونوں ہی مراد بھی ہیں۔ اس طرح ایک ہی فقرے میں قرآن کو بتدریج نازل کرنے کی بہت سی حکمتیں بیان کردی گئی ہیں:

(۱) وہ لفظ بلفظ حافظہ میں محفوظ ہوسکے، کیونکہ اس کی تبلیغ واشاعت تحریری صورت میں نہیں بلکہ ایک اَن پڑھ نبی کے ذریعے سے اَن پڑھ قوم میں زبانی تقریر کی شکل میں ہو رہی ہے۔

(۲) اُس کی تعلیمات اچھی طرح ذہن نشین ہوسکیں۔ اس کے لیے ٹھیر ٹھیر کر تھوڑی تھوڑی بات کہنا اور ایک ہی بات کو مختلف اوقات میں مختلف طریقوں سے بیان کرنا زیادہ مفید ہے۔

(۳) اُس کے بتائے ہوئے طریقِ زندگی پر دل جمتا جائے۔ اس کے لیے احکام وہدایات کا بتدریج نازل کرنا زیادہ مبنی برحکمت ہے، ورنہ اگر سارا قانون اور پورا نظامِ حیات بیک وقت بیان کرکے اسے قائم کرنے کا حکم دے دیا جائے تو ہوش پراگندہ ہو جائیں۔ علاوہ بریں یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر حکم اگر مناسب موقع پر دیا جائے تو اس کی حکمت اور روح زیادہ اچھی طرح سمجھ میں آتی ہے، بہ نسبت اس کے کہ تمام احکام دفعہ وار مرتب کرکے بیک وقت دے دیے گئے ہوں۔

(۴) حق اور باطل کی مسلسل کشمکش {کے دوران میں} نبی اور اُس کے پیرووں کی ہمت بندھائی جاتی رہے۔ اس کے لیے خدا کی طرف سے بار بار، وقتاً فوقتاً، موقع بموقع پیغام آنا زیادہ کارگر ہے بہ نسبت اس کے کہ بس ایک دفعہ ایک لمبا چوڑا ہدایت نامہ دے کر عمر بھر

وَلَا يَاْتُوْنَكَ بِمَثَلٍ اِلَّا جِئْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاَحْسَنَ تَفْسِيْرًا ﴿۳۳﴾
اَلَّذِيْنَ يُحْشَرُوْنَ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اِلٰى جَهَنَّمَ ۙ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا
وَّاَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿۳۴﴾ ع وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَجَعَلْنَآ مَعَهٗٓ ۳ ع ۱۴

اور (اسی غرض کے لیے) ہم نے اس کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ الگ الگ اجزاء کی شکل دی ہے۔ اور (اس میں یہ مصلحت بھی ہے) کہ جب کبھی وہ تمہارے سامنے کوئی نرالی بات (یا عجیب سوال) لے کر آئے، اُس کا ٹھیک جواب بروقت ہم نے تمہیں دے دیا اور بہترین طریقے سے بات کھول دی[۴۶] ـــــ جو لوگ اوندھے منہ جہنم کی طرف دھکیلے جانے والے ہیں ان کا موقف بہت برا ہے اور ان کی راہ حد درجہ غلط ہے۔[۴۷] ع

ہم نے موسیٰ کو کتاب[۴۸] دی اور اس کے ساتھ

کے لیے دنیا بھر کی مزاحمتوں کا مقابلہ کرنے کو یونہی چھوڑ دیا جائے۔

[۴۶] یہ نزولِ قرآن میں تدریج کا طریقہ اختیار کرنے کی ایک اور حکمت ہے۔ قرآن مجید کی شانِ نزول دراصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کفر اور جاہلیت اور فسق کے مقابلہ میں ایمان و اسلام اور اطاعت و تقویٰ کی ایک تحریک برپا کرنا چاہتا ہے اور اس کے لیے اس نے ایک نبی کو داعی و قائد بنا کر اُٹھایا ہے۔ اس تحریک کے دَوران میں اگر ایک طرف قائد اور اس کے پیروؤں کو حسبِ ضرورت تعلیم اور ہدایات دینا اس نے اپنے ذمہ لیا ہے تو دوسری طرف یہ کام بھی اپنے ہی ذمہ رکھا ہے کہ مخالفین جب کبھی کوئی اعتراض یا شبہہ یا اُلجھن پیش کریں اُسے وہ صاف کر دے۔ اور جب بھی وہ کسی بات کو غلط معنی پہنائیں اور اس کی صحیح تشریح و تفسیر کر دے۔ ان مختلف ضروریات کے لیے جو تقریریں اللہ کی طرف سے نازل ہو رہی ہیں ان کے مجموعے کا نام قرآن ہے، اور یہ ایک کتابِ آئین یا کتابِ اخلاق و فلسفہ نہیں بلکہ کتابِ تحریک ہے، جس کے معرضِ وجود میں آنے کی صحیح فطری صورت یہی ہے کہ تحریک کے اولِ لمحۂ آغاز کے ساتھ شروع ہو اور آخری لمحات تک جیسے جیسے تحریک چلتی رہے یہ بھی ساتھ ساتھ حسبِ موقع و ضرورت نازل ہوتی رہے۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو بحث مقدمہ)

[۴۷] یعنی جو لوگ سیدھی بات کو اُلٹی طرح سوچتے ہیں اور اُلٹے نتائج نکالتے ہیں ان کی عقل اوندھی ہے۔ اسی وجہ سے وہ قرآن کی حقانیت پر دلالت کرنے والی حقیقتوں کو اس کے بُطلان پر دلیل قرار دے رہے ہیں، اور اسی وجہ سے وہ اوندھے منہ جہنم کی طرف گھسیٹے جائیں گے۔

[۴۸] یہاں کتاب سے مراد غالباً وہ کتاب نہیں جو مصر سے نکلنے کے بعد حضرت موسیٰ کو دی گئی تھی، بلکہ اس سے مراد وہ ہدایات ہیں جو نبوت کے منصب پر مامور ہونے کے وقت سے لے کر {مصر سے نکلتے وقت} تک حضرت موسیٰ کو دی جاتی رہیں۔ ان میں وہ خطبے بھی شامل ہیں جو حضرت موسیٰ نے فرعون کے دربار میں دیے، اور وہ ہدایات بھی شامل ہیں جو فرعون کے خلاف جدوجہد کے دَوران میں آپ کو دی جاتی رہیں۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ ان چیزوں کا ذکر ہے، مگر اغلب یہ ہے کہ یہ چیزیں توراۃ میں شامل نہیں کی گئیں۔ توراۃ کا آغاز اُن احکامِ عشرہ سے ہوتا ہے جو خروج کے بعد طورِ سینا پر سنگین کتبوں کی شکل میں آپ کو دیے گئے تھے۔

اَخَاهُ هٰرُوْنَ وَزِيْرًا ﴿٣٥﴾ فَقُلْنَا اذْهَبَآ اِلَى الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَا ؕ فَدَمَّرْنٰهُمْ تَدْمِيْرًا ﴿٣٦﴾ ؕ وَقَوْمَ نُوْحٍ لَّمَّا كَذَّبُوا الرُّسُلَ
اَغْرَقْنٰهُمْ وَجَعَلْنٰهُمْ لِلنَّاسِ اٰيَةً ؕ وَاَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ عَذَابًا
اَلِيْمًا ﴿٣٧﴾ وَّعَادًا وَّثَمُوْدَاۡ وَاَصْحٰبَ الرَّسِّ وَقُرُوْنًا بَيْنَ ذٰلِكَ
كَثِيْرًا ﴿٣٨﴾ وَكُلًّا ضَرَبْنَا لَهُ الْاَمْثَالَ ۫ وَكُلًّا تَبَّرْنَا تَتْبِيْرًا ﴿٣٩﴾ وَلَقَدْ
اَتَوْا عَلَى الْقَرْيَةِ الَّتِيْٓ اُمْطِرَتْ مَطَرَ السَّوْءِ ؕ اَفَلَمْ يَكُوْنُوْا يَرَوْنَهَا ۚ

اس کے بھائی ہارونؑ کو مددگار کے طور پر لگایا اور اُن سے کہا کہ جاؤ اُس قوم کی طرف جس نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا [۴۹] ہے۔ آخر کار اُن لوگوں کو ہم نے تباہ کر کے رکھ دیا۔ یہی حال قومِ نوحؑ کا ہوا جب انہوں نے رسولوں کی تکذیب کی۔ [۵۰] ہم نے اُن کو غرق کر دیا اور دنیا بھر کے لوگوں کے لیے ایک نشانِ عبرت بنا دیا اور ان ظالموں کے لیے ایک دردناک عذاب ہم نے مہیا کر رکھا ہے۔ [۵۱] اِسی طرح عاد اور ثمود اور اصحابُ الرس [۵۲] اور بیچ کی صدیوں کے بہت سے لوگ تباہ کیے گئے۔ ان میں سے ہر ایک کو ہم نے (پہلے تباہ ہونے والوں کی) مثالیں دے دے کر سمجھایا اور آخر کار ہر ایک کو غارت کر دیا۔ اور اُس بستی پر تو اِن کا گزر ہو چکا ہے جس پر بدترین بارش برسائی گئی تھی۔ [۵۳] کیا اِنہوں نے اس کا حال دیکھا نہ ہو گا؟

[۴۹] یعنی اُن آیات کو جو حضرت یعقوب اور یوسف علیہما السلام کے ذریعے سے ان کو پہنچی تھیں، اور جن کی تبلیغ بعد میں ایک مدت تک بنی اسرائیل کے صلحاء کرتے رہے۔

[۵۰] چوں کہ انہوں نے سرے سے یہی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا کہ بشر کبھی رسول بن کر آ سکتا ہے، اس لیے ان کی تکذیب تنہا حضرت نوح علیہ السلام کی تکذیب ہی نہ تھی بلکہ بجائے خود منصبِ نبوت کی تکذیب تھی۔

[۵۱] یعنی آخرت کا عذاب۔

[۵۲] اصحاب الرّس کے متعلق تحقیق نہ ہو سکا کہ یہ کون لوگ تھے۔ مفسرین نے مختلف روایات بیان کی ہیں مگر ان میں کوئی چیز قابلِ اطمینان نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہی ہے کہ یہ ایک ایسی قوم تھی جس نے اپنے پیغمبر کو کنوئیں میں پھینک کر یا لٹکا کر مار دیا تھا۔ رس عربی زبان میں پُرانے کنوئیں یا اندھے کنوئیں کو کہتے ہیں۔

[۵۳] یعنی قومِ لوط کی بستی۔ بدترین بارش سے مراد پتھروں کی بارش ہے جس کا ذکر کئی جگہ قرآن مجید میں آیا ہے۔ اہلِ حجاز کے قافلے فلسطین و شام جاتے ہوئے اس علاقے سے گزرتے تھے اور {اس قوم کی} تباہی کے آثار دیکھتے تھے۔

بَلْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ نُشُوْرًا ﴿٤٠﴾ وَاِذَا رَاَوْكَ اِنْ يَّتَّخِذُوْنَكَ اِلَّا
هُزُوًا ؕ اَهٰذَا الَّذِيْ بَعَثَ اللّٰهُ رَسُوْلًا ﴿٤١﴾ اِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ
اٰلِهَتِنَا لَوْلَآ اَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ؕ وَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ حِيْنَ يَرَوْنَ
الْعَذَابَ مَنْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ﴿٤٢﴾ اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ
اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَيْهِ وَكِيْلًا ﴿٤٣﴾ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ

مگر یہ موت کے بعد دوسری زندگی کی توقع ہی نہیں رکھتے۔[۵۴]

یہ لوگ جب تمہیں دیکھتے ہیں تو تمہارا مذاق بنا لیتے ہیں۔ (کہتے ہیں) ''کیا یہ شخص ہے جسے خدا نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟ اِس نے تو ہمیں گمراہ کر کے اپنے معبودوں سے برگشتہ ہی کر دیا ہوتا اگر ہم اُن کی عقیدت پر جم نہ گئے ہوتے۔''[۵۵] اچھا، وہ وقت دور نہیں ہے جب عذاب دیکھ کر اِنھیں خود معلوم ہو جائے گا کہ کون گمراہی میں دور نکل گیا تھا۔

کبھی تم نے اُس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہو؟[۵٦] کیا تم ایسے شخص کو راہِ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں؟

[۵۴] یعنی چوں کہ یہ آخرت کے قائل نہیں ہیں اس لیے اِن آثارِ قدیمہ کا مشاہدہ انہوں نے محض ایک تماشائی کی حیثیت سے کیا، ان سے کوئی عبرت حاصل نہ کی۔

[۵۵] کفار کی یہ دونوں باتیں ایک دوسرے سے متضاد ہیں۔ پہلی بات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپ کو حقیر سمجھ رہے ہیں اور مذاق اُڑا کر آپ کی قدر گرانا چاہتے ہیں۔ دوسری بات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آپؐ کے دلائل کی قوت اور آپؐ کی شخصیت کا لوہا مان رہے ہیں اور بے ساختہ اعتراف کرتے ہیں کہ اگر ہم تعصب اور ہٹ دھرمی سے کام لے کر اپنے خداؤں کی بندگی پر جم نہ گئے ہوتے تو یہ شخص ہمارے قدم اُکھاڑ چکا ہوتا۔ یہ متضاد باتیں {ان کی حد سے زیادہ بوکھلاہٹ اور مرعوبیت کا کھلا ہوا ثبوت تھیں}۔

[۵٦] خواہشِ نفس کو خدا بنا لینے سے مراد اس کی بندگی کرنا ہے، اور یہ بھی حقیقت کے اعتبار سے ویسا ہی شرک ہے جیسا بُت کو پوجنا یا کسی مخلوق کو معبود بنانا۔ حضرت ابوامامہؓ کی روایت ہے کہ نبی ﷺ نے فرمایا: ما تحت ظل السمآء من اله يعبد من دون الله تعالٰی اعظم عند الله عزّ وجل من هوى يتبع ''اِس آسمان کے نیچے اللہ تعالیٰ کے سوا جتنے معبود بھی پوجے جا رہے ہیں ان میں اللہ کے نزدیک بدترین معبود وہ خواہشِ نفس ہے جس کی پیروی کی جا رہی ہو۔'' (طَبرانی) مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو الکہف، حاشیہ: ۵۰۔

جو شخص اپنی خواہش کو عقل کے تابع رکھتا ہو اور عقل سے کام لے کر فیصلہ کرتا ہو وہ اگر کسی قسم کے شرک یا کفر میں مبتلا بھی ہو تو اس کو سمجھا کر سیدھی راہ پر لایا جا سکتا ہے، لیکن نفس کا بندہ اور خواہشات کا غلام ایک شترِ بے مہار ہے۔ اُسے تو اس کی خواہشات جدھر جدھر لے جائیں گی وہ ان کے ساتھ ساتھ بھٹکتا پھرے گا۔ {ایسے شخص سے قبولِ حق کی کوئی توقع نہیں کی جا سکتی}۔

أَوْ يَعْقِلُونَ ۚ إِنْ هُمْ إِلَّا كَالْأَنْعَامِ ۖ بَلْ هُمْ أَضَلُّ سَبِيلًا ﴿٤٤﴾ ع
أَلَمْ تَرَ إِلَىٰ رَبِّكَ كَيْفَ مَدَّ الظِّلَّ وَلَوْ شَاءَ لَجَعَلَهُ سَاكِنًا
ثُمَّ جَعَلْنَا الشَّمْسَ عَلَيْهِ دَلِيلًا ﴿٤٥﴾ ثُمَّ قَبَضْنَاهُ إِلَيْنَا قَبْضًا

یہ تو جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ اُن سے بھی گئے گزرے۔[۵۷] ع

کیا تم نے دیکھا نہیں کہ تمہارا رب کس طرح سایہ پھیلا دیتا ہے؟ اگر وہ چاہتا تو اسے دائمی سایہ بنا دیتا۔ ہم نے سورج کو اُس پر دلیل[۵۸] بنایا، پھر (جیسے جیسے سورج اُٹھتا جاتا ہے) ہم اس سائے کو رفتہ رفتہ اپنی طرف سمیٹتے چلے جاتے ہیں۔[۵۹]

[۵۷] یعنی جس طرح بھیڑ بکریوں کو یہ پتہ نہیں ہوتا کہ ہانکنے والا انہیں چراگاہ کی طرف لے جا رہا ہے یا بوچڑ خانے کی طرف۔ وہ بس آنکھیں بند کر کے ہانکنے والے کے اشاروں پر چلتی رہتی ہیں، اسی طرح یہ عوام الناس بھی اپنے شیطانِ نفس اور اپنے گمراہ کن لیڈروں کے اشاروں پر آنکھیں بند کیے چلے جا رہے ہیں، کچھ نہیں جانتے کہ وہ انہیں فلاح کی طرف ہانک رہے ہیں یا تباہی و بربادی کی طرف۔ اس حد تک تو ان کی حالت بھیڑ بکریوں کے مشابہ ہے۔ لیکن بھیڑ بکریوں کو خدا نے عقل و شعور سے نہیں نوازا ہے۔ وہ اگر چرواہے اور قصائی میں امتیاز نہیں کرتیں تو کچھ عیب نہیں۔ البتہ حیف ہے ان انسانوں پر جو خدا سے عقل و شعور کی نعمتیں پا کر بھی اپنے آپ کو بھیڑ بکریوں کی سی غفلت و بے شعوری میں مبتلا کر لیں۔

اس تقریر کے اصل مخاطب سامعین ہی ہیں، اگرچہ روئے سخن بظاہر نبی ﷺ کی طرف ہے۔ دراصل سنانا ان کو مقصود ہے کہ غافلو، یہ کس حال میں پڑے ہوئے ہو۔ کیا خدا نے تمہیں سمجھ بوجھ اس لیے دی تھی کہ دنیا میں جانوروں کی طرح زندگی بسر کرو؟

[۵۸] ملاحوں کی اصطلاح میں دلیل اس شخص کو کہتے ہیں جو کشتیوں کو راستہ دکھاتا ہو۔ سائے پر سورج کو دلیل بنانے کا مطلب یہ ہے کہ سائے کا پھیلنا اور سکڑنا سورج کے عروج و زوال اور طلوع و غروب کا تابع ہے۔

[۵۹] اپنی طرف سمیٹنے سے مراد غائب اور فنا کرنا ہے، کیونکہ ہر چیز جو فنا ہوتی ہے وہ اللہ ہی کی طرف پلٹتی ہے۔ ہر شے اسی کی طرف سے آتی ہے اور اسی کی طرف جاتی ہے۔

اس آیت کے دو رُخ ہیں۔ ایک ظاہری، دوسرا باطنی۔ ظاہر کے اعتبار سے یہ غفلت میں پڑے ہوئے مشرکین کو بتا رہی ہے کہ اگر کچھ عقل سے کام لیتے تو یہی سایہ جس کا تم ہر وقت مشاہدہ کرتے ہو تمہیں یہ سبق دینے کے لیے کافی تھا کہ نبی جس توحید کی تعلیم تمہیں دے رہا ہے وہ بالکل برحق ہے۔ تمہاری ساری زندگی اسی سائے کے مدوجزر سے وابستہ ہے۔ ابدی سایہ ہو جائے تو زمین پر کوئی جان دار مخلوق، باقی نہ رہ سکے، سایہ بالکل نہ رہے تب بھی زندگی محال ہے، دھوپ اور سائے میں یک لخت تغیرات ہوتے رہیں تب بھی زمین کی مخلوقات اِن جھٹکوں کو زیادہ دیر تک نہیں سہار سکتی۔ مگر ایک صانع حکیم اور قادرِ مطلق ہے جس نے زمین اور سورج کے درمیان ایسی مناسبت قائم کر رکھی ہے جو دائماً ایک لگے بندھے طریقے سے آہستہ آہستہ سایہ ڈالتی اور بڑھاتی گھٹاتی ہے اور بتدریج دھوپ نکالتی اور چڑھاتی اتارتی رہتی ہے۔ یہ حکیمانہ نظام نہ اندھی فطرت کے ہاتھوں خود بخود قائم ہو سکتا ہے اور نہ بہت سے بااختیار خدا اسے قائم کر کے یوں ایک

يَسِيرًا ﴿٤٦﴾ وَهُوَ الَّذِي جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّالنَّوْمَ سُبَاتًا
وَّجَعَلَ النَّهَارَ نُشُورًا ﴿٤٧﴾ وَهُوَ الَّذِيٓ أَرْسَلَ الرِّيٰحَ بُشْرًاۢ
بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ ۚ وَأَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً طَهُورًا ﴿٤٨﴾ لِّنُحْـِۧيَ
بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا وَّنُسْقِيَهٗ مِمَّا خَلَقْنَآ أَنْعَامًا وَّأَنَاسِيَّ
كَثِيرًا ﴿٤٩﴾ وَلَقَدْ صَرَّفْنٰهُ بَيْنَهُمْ لِيَذَّكَّرُوا ۖ فَأَبٰىٓ أَكْثَرُ النَّاسِ

اوروہ اللہ ہی ہے جس نے رات کوتمہارے لیے لباس[٦٠]، اور نیند کوسکونِ موت، اوردن کو جی اُٹھنے کا وقت[٦١] بنایا۔

اور وہی ہے جو اپنی رحمت کے آگے آگے ہواؤں کو بشارت بنا کر بھیجتا ہے۔ پھر آسمان سے پاک[٦٢] پانی نازل کرتا ہے تاکہ ایک مردہ علاقے کو اس کے ذریعے زندگی بخشے اور اپنی مخلوق میں سے بہت سے جانوروں اور انسانوں کو سیراب کرے[٦٣]۔ اس کرشمے کو ہم بار بار ان کے سامنے لاتے ہیں[٦٤] تاکہ وہ کچھ سبق لیں، مگر اکثر لوگ کفر اور

مسلسل باقاعدگی کے ساتھ چلا سکتے تھے۔ {باطنی رخ اس آیت کا} یہ ہے کہ کفروشرک کی جہالت کا یہ سایہ جو اس وقت چھایا ہوا ہے، کوئی مستقل چیز نہیں ہے۔ آفتابِ ہدایت، قرآن اور محمد ﷺ کی صورت میں طلوع ہو چکا ہے۔ جوں جوں یہ آفتاب چڑھے گا، سایہ سمٹتا چلا جائے گا۔

[٦٠] یعنی ڈھانکنے اور چھپانے والی چیز۔

[٦١] اس آیت کے تین رُخ ہیں۔ ایک رُخ سے یہ توحید پر استدلال کر رہی ہے۔ دوسرے رُخ سے یہ روزمرہ کے انسانی تجربہ و مشاہدے سے زندگی بعدِ موت کے امکان کی دلیل فراہم کر رہی ہے۔ اور تیسرے رُخ سے یہ ایک لطیف انداز میں بشارت دے رہی ہے کہ جاہلیت کی رات ختم ہو چکی، اب علم وشعور اور ہدایت ومعرفت کا روزِ روشن نمودار ہو گیا ہے۔

[٦٢] یعنی ایسا پانی جو ہر طرح کی گندگیوں سے بھی پاک ہوتا ہے اور ہر طرح کے زہریلے مادّوں اور جراثیم سے بھی پاک۔ جس کی بدولت نجاستیں دُھلتی ہیں اور انسان، حیوان، نباتات، سب کو زندگی بخشنے والا جوہرِ خالص بہم پہنچتا ہے۔

[٦٣] اس آیت کے بھی وہی تین رُخ ہیں جو اوپر والی آیت کے تھے۔ اس میں توحید کے دلائل بھی ہیں اور آخرت کے دلائل بھی اور {یہ بشارت بھی} کہ جاہلیت کا دَور جو حقیقت میں خشک سالی اور قحط کا دور تھا {ختم ہو چکا ہے اور اس کی جگہ اللہ تعالیٰ} علمِ وحی کا خالص آبِ حیات برسا رہا ہے، سب نہیں تو بہت سے بندگانِ خدا تو اس سے فیض یاب ہوں گے ہی۔

[٦٤] اصل الفاظ ہیں لَقَدْ صَرَّفْنٰهُ۔ اس کے تین معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ بارش کے اس مضمون کو ہم نے بار بار قرآن میں بیان کر کے حقیقت سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ دوسرے یہ کہ ہم بار بار برسات اور اُس سے رونما ہونے والی رونقِ حیات کے کرشمے ان کو دکھاتے رہتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ ہم بارش کو گردش دیتے رہتے ہیں۔ یعنی ہمیشہ ہر جگہ یکساں بارش نہیں ہوتی۔

إِلَّا كُفُوْرًا ﴿٥٠﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَبَعَثْنَا فِيْ كُلِّ قَرْيَةٍ نَّذِيْرًا ﴿٥١﴾ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ﴿٥٢﴾ وَهُوَ الَّذِيْ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ هٰذَا عَذْبٌ فُرَاتٌ وَّهٰذَا مِلْحٌ اُجَاجٌ ۚ وَجَعَلَ

ناشکری کے سوا کوئی دوسرا رویہ اختیار کرنے سے انکار کر دیتے ہیں۔[٦٥]

اگر ہم چاہتے تو ایک ایک بستی میں ایک ایک خبردار کرنے والا اُٹھا کھڑا کرتے۔[٦٦] پس اے نبیؐ، کافروں کی بات ہرگز نہ مانو اور اس قرآن کو لے کر ان کے ساتھ زبردست جہاد کرو۔[٦٧]

اور وہی ہے جس نے دو سمندروں کو ملا رکھا ہے۔ ایک لذیذ و شیریں، دوسرا تلخ و شور۔ اور دونوں کے درمیان

[٦٥] اگر پہلے رُخ (یعنی توحید کی دلیل کے نقطۂ نظر) سے دیکھا جائے تو آیت کا مطلب یہ ہے کہ لوگ آنکھیں کھول کر دیکھیں تو محض بارش کے انتظام ہی میں {توحید باری} پر دلالت کرنے والی کافی نشانیاں موجود ہیں، مگر باوجود اس کے کہ ہم بار بار اس مضمون کی طرف توجہ دلاتے ہیں {یہ ناشکرے}، یہ ظالم کوئی سبق نہیں لیتے۔

دوسرے رُخ (یعنی آخرت کی دلیل کے نقطۂ نظر) سے دیکھا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر سال اِن کے سامنے برسات کی برکت سے مردہ نباتات وحشرات کے جی اُٹھنے کا ڈراما ہوتا رہتا ہے، مگر سب کچھ دیکھ کر بھی یہ بے وقوف زندگی بعد موت کو ناممکن ہی کہتے چلے جاتے ہیں۔ بار بار انہیں اس صریح نشانِ حقیقت کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے، مگر کفر و انکار کا جمود ہے کہ کسی طرح نہیں ٹوٹتا۔

اگر تیسرے رُخ (یعنی خشک سالی سے جاہلیت کی اور بارانِ رحمت سے وحی و نبوت کی تشبیہ) کو نگاہ میں رکھ کر دیکھا جائے تو آیت کا مطلب یہ ہے کہ انسانی تاریخ کے دَوران میں بار بار یہ منظر سامنے آتا رہا ہے کہ جب کبھی دنیا نبی اور کتابِ الٰہی کے فیض سے محروم ہوئی انسانیت بنجر ہو گئی۔ اور جب کبھی وحی و رسالت کا آبِ حیات اس سرزمین کو بہم پہنچ گیا، گلشنِ انسانیت لہلہا اُٹھا۔ یہ منظر تاریخ بھی بار بار دکھاتی ہے اور قرآن بھی اس کی طرف بار بار توجہ دلاتا ہے، مگر لوگ پھر بھی سبق نہیں لیتے۔ اور آج خدا نے نبی اور کتاب کی نعمت سے جس بستی کو نوازا ہے وہ اس کا شکر ادا کرنے کے بجائے اُلٹی ناشکری کرنے پر تلی ہوئی ہے۔

[٦٦] یعنی ایسا کرنا ہماری قدرت سے باہر نہ تھا، چاہتے تو جگہ جگہ نبی پیدا کر سکتے تھے، مگر ہم نے ایسا نہیں کیا اور دنیا بھر کے لیے ایک ہی نبی مبعوث کر دیا۔ جس طرح ایک سورج سارے جہاں کے لیے کافی ہو رہا ہے اُسی طرح یہ اکیلا آفتابِ ہدایت ہی سب جہان والوں کے لیے کافی ہے۔

[٦٧] جہادِ کبیر کے تین معنی ہیں۔ ایک، انتہائی کوشش جس میں آدمی سعی و جاں فشانی کا کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھے۔ دوسرے، بڑے پیمانے پر جدوجہد جس میں آدمی اپنے تمام ذرائع لا کر ڈال دے۔ تیسرے، جامع جدوجہد جس میں آدمی کوشش کا کوئی پہلو اور مقابلے کا کوئی محاذ نہ چھوڑے۔ اس میں زبان و قلم کا جہاد بھی شامل ہے اور جان و مال کا بھی اور توپ و تفنگ کا بھی۔

بَيْنَهُمَا بَرْزَخًا وَّحِجْرًا مَّحْجُوْرًا ﴿٥٣﴾ وَهُوَ الَّذِيْ خَلَقَ مِنَ الْمَآءِ
بَشَرًا فَجَعَلَهٗ نَسَبًا وَّصِهْرًا ؕ وَكَانَ رَبُّكَ قَدِيْرًا ﴿٥٤﴾ وَيَعْبُدُوْنَ
مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُهُمْ وَلَا يَضُرُّهُمْ ؕ وَكَانَ الْكَافِرُ عَلٰى

ایک پردہ حائل ہے۔ایک رکاوٹ ہے جوانہیں گڈمڈ ہونے سے روکے ہوئے ہے۔[٦٨]

اور وہی ہے جس نے پانی سے ایک بشر پیدا کیا، پھر اس سے نسب اور سسرال کے دو الگ سلسلے چلائے۔[٦٩]

تیرا رب بڑا ہی قدرت والا ہے۔

اس خدا کو چھوڑ کر لوگ اُن کو پوج رہے ہیں جو نہ ان کو نفع پہنچا سکتے ہیں نہ نقصان، اور اوپر سے مزید یہ کہ کافر اپنے رب کے مقابلے میں ہر باغی کا مددگار بنا ہوا ہے۔[٧٠]

[٦٨] یہ کیفیت ہر اُس جگہ رونما ہوتی ہے جہاں کوئی بڑا دریا سمندر میں آکر گرتا ہے۔اس کے علاوہ خود سمندر میں بھی مختلف مقامات پر میٹھے پانی کے چشمے پائے جاتے ہیں جن کا پانی سمندر کے نہایت تلخ پانی کے درمیان بھی اپنی مٹھاس پر قائم رہتا ہے۔ترکی امیر البحر سیدی علی رئیس (کاتبِ رومی) اپنی کتاب مرآۃ الممالک میں، جو سولہویں صدی عیسوی کی تصنیف ہے، خلیج فارس کے اندر ایسے ہی ایک مقام کی نشان دہی کرتا ہے۔اس نے لکھا ہے کہ وہاں آبِ شور کے نیچے آبِ شیریں کے چشمے ہیں، جن سے میں خود اپنے بیڑے کے لیے پینے کا پانی حاصل کرتا رہا ہوں۔بحرین کے قریب بھی سمندر کی تہ سے اس قسم کے بہت سے چشمے نکلے ہوئے ہیں جن سے لوگ میٹھا پانی حاصل کرتے ہیں۔

یہ تو ہے آیت کا ظاہری مضمون، جو اللہ کی قدرت کے ایک کرشمے سے اُس کے الٰہ واحد اور ربِّ واحد ہونے پر استدلال کررہا ہے۔مگر اس کے بین السطور سے بھی ایک لطیف اشارہ ایک دوسرے مضمون کی طرف نکلتا ہے، اور وہ یہ ہے کہ انسانی معاشرے کا سمندر خواہ کتنا ہی تلخ شور ہو جائے، اللہ جب چاہے اُس کی تہ سے ایک جماعتِ صالحہ کا چشمۂ شیریں نکال سکتا ہے۔

[٦٩] یعنی بجائے خود یہی کرشمہ کیا کم تھا کہ وہ ایک حقیر پانی کی بوند سے انسان جیسی حیرت انگیز مخلوق بنا کھڑی کرتا ہے، مگر اس پر مزید کرشمہ یہ ہے کہ اس نے انسان کا بھی ایک نمونہ نہیں بلکہ دو الگ نمونے (عورت اور مرد) بنائے، جن سے ایک سلسلۂ تعلقات بیٹوں اور پوتوں کا چلتا ہے جو دوسرے گھروں سے بہوئیں لاتے ہیں، اور ایک دوسرا سلسلۂ تعلقات بیٹیوں اور نواسیوں کا چلتا ہے جو دوسرے گھروں کی بہوئیں بن کر جاتی ہیں۔اس طرح خاندان سے خاندان جڑ کر پورے پورے ملک ایک نسل اور ایک تمدن سے وابستہ ہو جاتے ہیں۔

[٧٠] یعنی اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور اس کے احکام و قوانین کو نافذ کرنے کے لیے جو کوشش بھی کہیں ہو رہی ہو، کافر کی {عملی یا کم از کم دلی} ہمدردیاں اس کوشش کے ساتھ نہیں بلکہ اُن لوگوں کے ساتھ ہوں گی جو اُسے نیچا دکھانے کے درپے ہوں۔اسی طرح اللہ کی فرماں برداری و اطاعت سے نہیں بلکہ اس کی نافرمانی ہی سے کافر کی ساری دلچسپیاں وابستہ ہوں گی۔

رَبِّهٖ ظَهِيْرًا ﴿۵۵﴾ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ﴿۵۶﴾ قُلْ مَآ
اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ﴿۵۷﴾
وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهٖ ؕ وَكَفٰى
بِهٖ بِذُنُوْبِ عِبَادِهٖ خَبِيْرًا ﴿۵۸﴾ ۚۛ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ
مع وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۛ اَلرَّحْمٰنُ
فَسْـَٔلْ بِهٖ خَبِيْرًا ﴿۵۹﴾ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمُ اسْجُدُوْا لِلرَّحْمٰنِ قَالُوْا وَمَا

عند المتقدمین ۱۲

اے نبیؐ، تم کو تو ہم نے بس ایک بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔[۷۱] اِن سے کہہ دو کہ ”میں اس کام پر تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا، میری اجرت بس یہی ہے کہ جس کا جی چاہے وہ اپنے رب کا راستہ اختیار کرلے۔[۷۱ الف]“ اے نبیؐ، اُس خدا پر بھروسا رکھو جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں۔ اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو۔ اپنے بندوں کے گناہوں سے بس اُسی کا باخبر ہونا کافی ہے۔ وہ جس نے چھ دنوں میں زمین اور آسمانوں کو اور اُن ساری چیزوں کو بنا کر رکھ دیا جو آسمان و زمین کے درمیان ہیں، پھر آپ ہی (کائنات کے تختِ سلطنت) ”عرش“ پر جلوہ فرما ہوا۔[۷۲] رحمٰن، اس کی شان کسی جاننے والے سے پوچھو۔

اِن لوگوں سے جب کہا جاتا ہے کہ اس رحمان کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں

[۷۱] یعنی تمہارا کام نہ کسی ایمان لانے والے کو جزا دینا ہے، نہ کسی انکار کرنے والے کو سزا دینا۔ تم کسی کو ایمان کی طرف کھینچ لانے اور انکار سے زبردستی روک دینے پر مامور نہیں کیے گئے ہو۔ تمہاری ذمہ داری اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ جو راہِ راست قبول کرے اسے انجامِ نیک کی بشارت دے دو، اور جو اپنی بدراہی پر جما رہے اس کو اللہ کی پکڑ سے ڈرا دو۔

اس طرح کے ارشادات قرآن مجید میں جہاں بھی آئے ہیں ان کا اصل روئے سخن کفار کی طرف ہے، اور مقصد دراصل ان کو یہ بتانا ہے کہ نبی ایک بے غرض مصلح ہے جو خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے خدا کا پیغام پہنچاتا ہے۔ {اگر تم اس کی بات} مانو گے تو اپنا ہی بھلا کرو گے، اسے کچھ نہ دے دو گے۔ نہ مانو گے تو اپنا نقصان کرو گے، اس کا کچھ نہ بگاڑو گے۔ وہ پیغام پہنچا کر سبکدوش ہو چکا، اب تمہارا معاملہ ہم سے ہے۔

[۷۱ الف] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو المومنون، حاشیہ ۷۰۔

[۷۲] اللہ تعالیٰ کے عرش پر جلوہ گر ہونے کی تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، الاعراف، حواشی ۴۱، ۴۲۔ یونس، حاشیہ ۴، ھود، حاشیہ: ۷۔ زمین و آسمان کو چھ دنوں میں پیدا کرنے کا مضمون متشابہات کے قبیل سے ہے جس کا مفہوم متعین کرنا مشکل ہے۔ ممکن ہے کہ ایک دن سے مراد ایک دَور ہو۔ اور ممکن ہے کہ اس سے مراد وقت کی اتنی ہی مقدار ہو جس پر ہم دنیا میں لفظ دن کا اطلاق کرتے ہیں۔ (مفصل تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، حٰم السجدہ، حواشی ۱۱ تا ۱۵)

الرَّحْمٰنُ ۚ أَنَسْجُدُ لِمَا تَأْمُرُنَا وَزَادَهُمْ نُفُوْرًا ﴿٦٠﴾ تَبٰرَكَ الَّذِيْ
جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ﴿٦١﴾
وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ
اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ﴿٦٢﴾ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ

''رحمان کیا ہوتا ہے؟ کیا بس جسے تو کہہ دے اسی کو ہم سجدہ کرتے پھریں؟''[۷۳] یہ دعوت ان کی نفرت میں اُلٹا اور اضافہ کر دیتی ہے۔[۷۴] ع

بڑا متبرّک ہے وہ جس نے آسمان میں بُرج بنائے[۷۵] اور اس میں ایک چراغ[۷۶] اور ایک چمکتا چاند روشن کیا۔ وہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین بنایا، ہر اس شخص کے لیے جو سبق لینا چاہے، یا شکر گزار ہونا چاہے۔[۷۷]

رحمان کے (اصلی) بندے وہ[۷۸] ہیں جو زمین پر نرم چال چلتے ہیں[۷۹]

[۷۳] یہ بات دراصل وہ محض کافرانہ شوخی اور سراسر ہٹ دھرمی کی بنا پر کہتے تھے، جس طرح فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے کہا تھا وَمَا رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ''رب العالمین کیا ہوتا ہے''؟ حالاں کہ نہ کفارِ مکہ خدائے رحمان سے بے خبر تھے اور نہ فرعون ہی اللہ رب العالمین سے ناواقف تھا۔ بعض مفسّرین نے اس کی یہ تاویل کی ہے کہ اہلِ عرب کے ہاں اللہ تعالیٰ کے لیے ''رحمان'' کا اسمِ مبارک شائع نہ تھا اس لیے انہوں نے یہ اعتراض کیا۔ لیکن آیت کا اندازِ کلام خود بتا رہا ہے کہ یہ اعتراض ناواقفیت کی بنا پر نہیں بلکہ طُغیانِ جاہلیت کی بنا پر تھا، علاوہ بریں یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہے کہ عرب میں اللہ تعالیٰ کے لیے قدیم زمانے سے رحمان کا لفظ معروف و مستعمل تھا۔ ملاحظہ ہو، السجدہ، حاشیہ ۵۔ سبا، حاشیہ ۳۵۔

[۷۴] اس جگہ سجدۂ تلاوت مشروع ہے اور اس پر تمام اہلِ علم متفق ہیں۔ نیز یہ بھی مسنون ہے کہ آدمی جب اس آیت کو سنے تو جواب میں کہے: زَادَنَا اللّٰهُ خُضُوْعًا مَازَادَ لِلْاَعْدَآءِ نُفُوْرًا ''اللہ کرے ہمارا خضوع اتنا ہی بڑھے جتنا دشمنوں کا نفور بڑھتا ہے۔''

[۷۵] تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، الحجر، حواشی ۸ تا ۱۲۔

[۷۶] یعنی سورج، جیسا کہ سورۂ نوح میں بتصریح فرمایا وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا (آیت:۱۶)۔

[۷۷] یہ دو مراتب ہیں جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے الگ اور اپنے مزاج کے اعتبار سے لازم و ملزوم ہیں۔ گردش لیل و نہار کے نظام پر غور کرنے کا پہلا نتیجہ یہ ہے کہ آدمی اس سے توحید کا درس لے اور اگر خدا سے غفلت میں پڑا ہوا تھا تو چونک جائے۔ اور دوسرا نتیجہ یہ ہے کہ خدا کی ربوبیت کا احساس کر کے سرِ نیاز جھکا دے اور سراپا امتنان بن جائے۔

[۷۸] یعنی جس رحمان کو سجدہ کرنے کے لیے تم سے کہا جا رہا ہے اور تم اس سے انحراف کر رہے ہو اس کے پیدائشی بندے تو سب ہی ہیں، مگر اس کے محبوب و پسندیدہ بندے وہ ہیں جو شعوری طور پر بندگی اختیار کر کے یہ اور یہ صفات اپنے اندر پیدا کرتے ہیں۔ نیز یہ کہ وہ سجدہ جس کی تمہیں دعوت دی جا رہی ہے اُس کے نتائج یہ ہیں جو اس کی بندگی قبول کرنے والوں کی زندگی میں نظر آتے ہیں، اور اس سے انکار کے نتائج وہ ہیں جو تم لوگوں کی زندگی میں عیاں ہیں۔

[۷۹] یعنی تکبر کے ساتھ اکڑتے اور اینٹھتے ہوئے نہیں چلتے، جبّاروں اور مفسدوں کی طرح اپنی رفتار سے اپنا زور جتانے کی

هَوْنًا وَّاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا ﴿٦٣﴾ وَالَّذِيْنَ يَبِيْتُوْنَ
لِرَبِّهِمْ سُجَّدًا وَّقِيَامًا ﴿٦٤﴾ وَالَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اصْرِفْ عَنَّا
عَذَابَ جَهَنَّمَ ۖ اِنَّ عَذَابَهَا كَانَ غَرَامًا ﴿٦٥﴾ اِنَّهَا سَآءَتْ
مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿٦٦﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ
يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ﴿٦٧﴾ وَالَّذِيْنَ لَا يَدْعُوْنَ
مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ وَلَا يَقْتُلُوْنَ النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا

اور جاہل ان کے منہ آئیں تو کہہ دیتے ہیں کہ تم کو سلام۔[٨٠] جو اپنے رب کے حضور سجدے اور قیام میں راتیں گزارتے ہیں۔[٨١] جو دعائیں کرتے ہیں کہ ”اے ہمارے رب، جہنم کے عذاب سے ہم کو بچالے، اُس کا عذاب تو جان کا لاگو ہے، وہ تو بڑا ہی بُرا مستقر اور مقام ہے۔“[٨٢] جو خرچ کرتے ہیں تو نہ فضول خرچی کرتے ہیں نہ بخل، بلکہ اُن کا خرچ دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال پر قائم رہتا ہے۔[٨٣] جو اللہ کے سوا کسی اور معبود کو نہیں پکارتے، اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں

کوشش نہیں کرتے، بلکہ ان کی چال ایک شریف اور سلیم الطبع اور نیک مزاج آدمی کی سی چال ہوتی ہے۔ ”نرم چال“ سے مراد ضعیفانہ اور مریضانہ چال نہیں ہے، اور نہ وہ چال ہے جو ایک ریاکار آدمی اپنے انکسار کی نمائش کرنے یا اپنی خدا ترسی کا مظاہرہ کرنے کے لیے تصنّع سے اختیار کرتا ہے۔ {بلکہ اس سے مراد ایک بھلے مانس کی سی فطری چال ہے}۔ نبی ﷺ خود اِس طرح مضبوط قدم رکھتے ہوئے چلتے تھے کہ گویا نشیب کی طرف اُتر رہے ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، بنی اسرائیل، حاشیہ ٤٣۔ لقمان، حاشیہ ٣٣)

[٨٠] جاہل سے مراد وہ شخص ہے جو جہالت پر اُتر آئے اور کسی شریف آدمی سے بدتمیزی کا برتاؤ کرنے لگے۔ رحمان کے بندوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کسی بھی بیہودگی کا جواب ویسی ہی بیہودگی سے نہیں دیتے بلکہ جو ان کے ساتھ یہ رویہ اختیار کرتا ہے وہ اس کو سلام کر کے الگ ہو جاتے ہیں۔ (تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، القصص، حواشی ٧٢-٧٨)

[٨١] یعنی وہ اُن کے دن کی زندگی تھی اور یہ ان کی راتوں کی زندگی ہے۔ ان کی راتیں نہ عیاشی میں گزرتی ہیں نہ ناچ گانے میں، نہ لہو و لعب میں، نہ ڈاکے مارنے اور چوریاں کرنے میں۔ جاہلیت کے ان معروف مشاغل کے برعکس یہ اِس معاشرے کے وہ لوگ ہیں جن کی راتیں خدا کے حضور کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے دعا و عبادت کرتے گزرتی ہیں۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ ان کی زندگی کے اس پہلو کو نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے سورۂ سجدہ (آیت ١٦)، سورۂ ذاریات (آیات ١٧، ١٨) اور سورۂ زمر (آیت ٩)۔

[٨٢] یعنی یہ عبادت اُن میں کوئی غرور پیدا نہیں کرتی۔ بلکہ اپنی ساری نیکیوں اور عبادتوں کے باوجود وہ اِس خوف سے کانپتے رہتے ہیں کہ کہیں ہمارے عمل کی کوتاہیاں ہم کو مبتلائے عذاب نہ کر دیں۔ وہ اپنی انسانی کمزوریوں کا اعتراف کرتے ہوئے عذاب سے بچ نکلنے ہی کو غنیمت سمجھتے ہیں، اور اس کے لیے بھی ان کا اعتماد اپنے عمل پر نہیں بلکہ اللہ کے رحم و کرم پر ہوتا ہے۔

[٨٣] یعنی {عام اہلِ عرب کے برخلاف} نہ تو ان کا حال یہ ہے کہ عیاشی، اور شادی بیاہ {اور دکھاوے کے کاموں} میں بے دریغ روپیہ خرچ کریں۔ اور نہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ ایک زر پرست آدمی کی طرح پیسہ جوڑ جوڑ کر رکھیں، نہ خود کھائیں، نہ بال بچوں کی ضروریات

بِالْحَقِّ وَلَا يَزْنُوْنَ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ يَلْقَ اَثَامًا ﴿٦٨﴾
يُّضٰعَفْ لَهُ الْعَذَابُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَيَخْلُدْ فِيْهٖ مُهَانًا ﴿٦٩﴾ اِلَّا مَنْ
تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ
حَسَنٰتٍ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ﴿٧٠﴾ وَمَنْ تَابَ وَعَمِلَ صَالِحًا

کرتے، اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔[۸۴] یہ کام جو کوئی کرے وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا، قیامت کے روز اُس کو مکرّر عذاب دیا جائے گا[۸۵] اور اسی میں وہ ہمیشہ ذلّت کے ساتھ پڑا رہے گا۔ اِلّا یہ کہ کوئی (ان گناہوں کے بعد) توبہ کر چکا ہو اور ایمان لا کر عملِ صالح کرنے لگا ہو۔[۸۶] ایسے لوگوں کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے بدل دے گا[۸۷] اور وہ بڑا غفورٌ رحیم ہے۔ جو شخص توبہ کرکے نیک عملی اختیار کرتا ہے

اپنی استطاعت کے مطابق پوری کریں، اور نہ کسی راہِ خیر میں خوش دلی کے ساتھ کچھ دیں۔

اسلامی نقطۂ نظر سے اسراف تین چیزوں کا نام ہے۔ ایک، ناجائز کاموں میں دولت صرف کرنا، دوسرے، جائز کاموں میں خرچ کرتے ہوئے حد سے تجاوز کر جانا، تیسرے، نیکی کے کاموں میں خرچ کرنا، مگر اللہ کے لیے نہیں بلکہ ریا اور نمائش کے لیے۔ اس کے برعکس بخل کا اطلاق دو چیزوں پر ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ آدمی اپنی اور اپنے بال بچوں کی ضروریات پر اپنی مقدرت اور حیثیت کے مطابق خرچ نہ کرے۔ دوسرے یہ کہ نیکی اور بھلائی کے کاموں میں اس کے ہاتھ سے پیسہ نہ نکلے۔ ان دونوں انتہاؤں کے درمیان اعتدال کی راہ اسلام کی راہ ہے۔

[۸۴] یعنی وہ ان تین بڑے گناہوں سے پرہیز کرتے ہیں جن میں اہلِ عرب کثرت سے مبتلا ہیں۔ ایک شرک باللہ، دوسرے قتلِ ناحق، تیسرے زنا۔ اسی مضمون کو نبی ﷺ نے بکثرت احادیث میں بیان فرمایا ہے۔

[۸۵] اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ عذاب کا سلسلہ ٹوٹنے نہ پائے گا، بلکہ پے در پے جاری رہے گا۔ دوسرے یہ کہ جو شخص کفر یا شرک یا دہریت و الحاد کے ساتھ قتل اور زنا اور دوسری معصیتوں کا بوجھ لیے ہوئے جائے گا اُس کو بغاوت کی سزا الگ ملے گی اور ایک ایک جرم کی سزا الگ الگ۔

[۸۶] یہ بشارت ہے ان لوگوں کے لیے جن کی زندگی پہلے طرح طرح کے جرائم سے آلودہ رہی ہو اور اب وہ اپنی اصلاح پر آمادہ ہوں۔ یہی عام معافی (General Amnesty) کا اعلان تھا جس نے اُس بگڑے ہوئے معاشرے کے لاکھوں افراد کو سہارا دے کر مستقل بگاڑ سے بچا لیا۔ اِسی نے ان کو اُمید کی روشنی دکھائی اور اصلاحِ حال پر آمادہ کیا۔ ورنہ اگر ان سے یہ کہا جاتا کہ جو گناہ تم کر چکے ہو ان کی سزا سے اب تم کسی طرح نہیں بچ سکتے، تو یہ انہیں مایوس کر کے ہمیشہ کے لیے بدی کے بھنور میں پھنسا دیتا اور کبھی ان کی اصلاح نہ ہو سکتی۔

[۸۷] اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ جب وہ توبہ کر لیں گے تو کفر کی زندگی میں جو برے افعال وہ پہلے کیا کرتے تھے ان کی جگہ اب طاعت اور ایمان کی زندگی میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نیک افعال کرنے لگیں گے اور تمام برائیوں کی جگہ بھلائیاں لے لیں گی۔ دوسرے یہ کہ توبہ کے نتیجہ میں صرف اتنا ہی نہ ہوگا کہ ان کے نامۂ اعمال سے وہ تمام قصور کاٹ دیے جائیں گے جو انہوں نے کفر و گناہ کی زندگی میں کیے تھے، بلکہ ان کی جگہ ہر ایک کے نامۂ اعمال میں یہ نیکی لکھ دی جائے گی کہ یہ وہ بندہ ہے جس نے بغاوت اور نافرمانی کو چھوڑ

فَاِنَّهٗ یَتُوْبُ اِلَى اللّٰهِ مَتَابًا ﴿۷۱﴾ وَالَّذِیْنَ لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ
وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴿۷۲﴾ وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ
لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا ﴿۷۳﴾ وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا هَبْ
لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ

وہ تو اللہ کی طرف پلٹ آتا ہے جیسا کہ پلٹنے کا حق ہے[۸۸] ــــ (اور رحمٰن کے بندے وہ ہیں) جو جھوٹ کے گواہ نہیں بنتے[۸۹] اور کسی لغو چیز پر اُن کا گزر ہو جائے تو شریف آدمیوں کی طرح گزر جاتے ہیں۔[۹۰] جنہیں اگر اُن کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اس پر اندھے اور بہرے بن کر نہیں رہ جاتے۔[۹۱] جو دعائیں مانگا کرتے ہیں کہ "اے ہمارے رب ہمیں اپنی بیویوں اور اپنی اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک[۹۲] دے اور ہم کو پرہیز گاروں کا

کر طاعت وفرماں برداری اختیار کرلی۔ پھر جتنی بار بھی وہ اپنی سابقہ زندگی کے بُرے اعمال کو یاد کر کے نادم ہوا ہوگا اور اس نے اپنے خدا سے استغفار کیا ہوگا اس کے حساب میں اتنی ہی نیکیاں لکھ دی جائیں گی، اس طرح اس کے نامۂ اعمال میں تمام پچھلی بُرائیوں کی جگہ بھلائیاں لے لیں گی۔

[۸۸] یعنی فطرت کے اعتبار سے بھی بندے کا اصلی مرجع اسی کی بارگاہ ہے، اور اخلاقی حیثیت سے بھی وہی ایک بارگاہ ہے جس کی طرف اسے پلٹنا چاہیے، اور نتیجے کے اعتبار سے بھی اس بارگاہ کی طرف پلٹنا مفید ہے، علاوہ بریں اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ وہ پلٹ کر ایک ایسی بارگاہ کی طرف جاتا ہے جو واقعی ہے ہی پلٹنے کے قابل جگہ، بہترین بارگاہ، جہاں سے پلٹنے والے کے لیے معافی ہی معافی اور بھلائی ہی بھلائی ہے۔

[۸۹] اس کے بھی دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کسی جھوٹی بات کی گواہی نہیں دیتے۔ دوسرے یہ کہ وہ جھوٹ کا مشاہدہ نہیں کرتے، اس کے تماشائی نہیں بنتے، اس کو دیکھنے کا قصد نہیں کرتے۔ اس دوسرے مطلب کے اعتبار سے "جھوٹ" کا لفظ باطل اور شر کا ہم معنی ہے۔ انسان جس برائی کی طرف بھی جاتا ہے، لذت یا خوش نمائی یا ظاہری فائدے کے اُس جھوٹے ملمع کی وجہ سے جاتا ہے جو شیطان نے اس پر چڑھا رکھا ہے۔ لہٰذا ہر باطل، ہر گناہ اور ہر بدی اس لحاظ سے جھوٹ ہے کہ وہ اپنی چمک دمک کی وجہ ہی سے اپنی طرف لوگوں کو کھینچتی ہے۔

[۹۰] "لغو" کا لفظ اُس "جھوٹ" پر بھی حاوی ہے جس کی تشریح اوپر کی جا چکی ہے، اور اس کے ساتھ تمام فضول لایعنی اور بے فائدہ باتیں اور کام بھی اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ (مزید تشریح کے لیے ملاحظہ ہو، المومنون، حاشیہ: ۴)

[۹۱] اصل میں الفاظ ہیں لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْهَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا، جن کا لفظی ترجمہ یہ ہے: "وہ ان پر اندھے بہرے بن کر نہیں گرتے۔" لیکن یہاں "گرنے" کا لفظ اپنے لُغوی معنی کے لیے نہیں بلکہ محاورے کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے لوگ نہیں ہیں جو اللہ کی آیات سن کر ٹس سے مس نہ ہوں، بلکہ وہ ان کا گہرا اثر قبول کرتے ہیں۔ جو ہدایت اُن آیات میں آئی ہو اُس کی پیروی کرتے ہیں۔

[۹۲] یعنی اُن کو ایمان اور عملِ صالح کی توفیق دے اور پاکیزہ اخلاق سے آراستہ کر، کیوں کہ ایک مومن کو بیوی بچوں کے حسن و جمال اور عیش و آرام سے نہیں بلکہ ان کی نیک خصالی سے ٹھنڈک حاصل ہوتی ہے۔ اس کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی چیز تکلیف دہ نہیں ہوسکتی کہ جو دنیا میں اس کو سب سے زیادہ پیارے ہیں انہیں دوزخ کا ایندھن بننے کے لیے تیار ہوتے دیکھے۔

اِمَامًا ﴿۷۴﴾ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا وَيُلَقَّوْنَ فِيْهَا تَحِيَّةً
وَّسَلٰمًا ﴿۷۵﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ؕ حَسُنَتْ مُسْتَقَرًّا وَّمُقَامًا ﴿۷۶﴾ قُلْ مَا يَعْبَؤُا
بِكُمْ رَبِّيْ لَوْلَا دُعَآؤُكُمْ ۚ فَقَدْ كَذَّبْتُمْ فَسَوْفَ يَكُوْنُ لِزَامًا ﴿۷۷﴾ ع

امام بنا[۹۳]"۔۔۔۔ یہ ہیں وہ لوگ جو اپنے صبر[۹۴] کا پھل منزلِ بلند کی شکل میں پائیں گے۔[۹۵] آداب وتسلیمات سے اُن کا استقبال ہوگا۔ وہ ہمیشہ ہمیشہ وہاں رہیں گے۔ کیا ہی اچھا ہے وہ مستقر اور وہ مقام۔

اے نبیؐ، لوگوں سے کہو "میرے رب کو تمہاری کیا حاجت پڑی ہے اگر تم اُس کو نہ پکارو۔[۹۶] اب کہ تم نے جھٹلا دیا ہے، عنقریب وہ سزا پاؤ گے کہ جان چھڑانی محال ہوگی۔" ع

[۹۳] یعنی ہم تقویٰ اور طاعت میں سب سے بڑھ جائیں، بھلائی اور نیکی میں سب سے آگے نکل جائیں، محض نیک ہی نہ ہوں بلکہ نیکوں کے پیشوا ہوں اور ہماری بدولت دنیا بھر میں نیکی پھیلے۔ اس چیز کا ذکر بھی یہاں دراصل یہ بتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو مال و دولت اور شوکت وحشمت میں نہیں بلکہ نیکی و پرہیزگاری میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرتے ہیں۔

[۹۴] صبر کا لفظ یہاں اپنے وسیع ترین مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ دشمنانِ حق کے مظالم کو مردانگی کے ساتھ برداشت کرنا۔ دینِ حق کو قائم اور سربلند کرنے کی جدوجہد میں ہر قسم کے مصائب اور تکلیفوں کو سہہ جانا۔ ہر خوف اور لالچ کے مقابلے میں راہِ راست پر ثابت قدم رہنا۔ شیطان کی تمام ترغیبات اور نفس کی ساری خواہشات کے علی الرغم فرض کو بجالانا، غرض اس ایک لفظ کے اندر دین اور دینی رویّے اور دینی اخلاق کی ایک دنیا کی دنیا سمو کر رکھ دی گئی ہے۔

[۹۵] اصل میں لفظ غُرْفَة استعمال ہوا ہے جس کے معنی بلند و بالا عمارت کے ہیں۔ اس کا ترجمہ عام طور پر "بالاخانہ" کیا جاتا ہے جس سے آدمی کے ذہن میں ایک دو منزلہ کوٹھے کی سی تصویر آجاتی ہے۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں انسان جو بڑی سے بڑی اور اونچی سے اونچی عمارتیں بناتا ہے، حتیٰ کہ ہندستان کا روضۂ تاج اور امریکہ کے "فلک شگاف" (Sky-Scrapers) تک جنت کے اُن محلات کی محض ایک بھونڈی سی نقل ہیں جن کا ایک دھندلا سا نقشہ اولادِ آدم کے لاشعور میں محفوظ چلا آتا ہے۔

[۹۶] یعنی اگر تم اللہ سے دعائیں نہ مانگو، اور اس کی عبادت نہ کرو، اور اپنی حاجات میں اس کو مدد کے لیے نہ پکارو، تو پھر تمہارا کوئی وزن بھی اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں نہیں ہے جس کی وجہ سے وہ پرکاہ کے برابر بھی تمہاری پروا کرے۔ محض مخلوق ہونے کی حیثیت سے تم میں اور پتھروں میں کوئی فرق نہیں۔ تم سے اللہ کی کوئی حاجت اٹکی ہوئی نہیں ہے کہ تم بندگی نہ کرو گے تو اس کا کوئی کام رُکا رہ جائے گا۔ اس کی نگاہِ التفات کو جو چیز تمہاری طرف مائل کرتی ہے وہ تمہارا اُس کی طرف ہاتھ پھیلانا اور اس سے دعائیں مانگنا ہی ہے۔ یہ کام نہ کرو گے تو کوڑے کرکٹ کی طرح پھینک دیے جاؤ گے۔